تقصیراتِ تفہیم

یعنی

تفہیم القرآن کا مکمل اور مدلل جائزہ

از قلم

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، بجنور

ملنے کا پتہ

مدنی دار التالیف بجنور یوپی

تقصیراتِ تفہیم

یعنی

تفہیم القرآن کا مکمل و مدلل جائزہ

از

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری

ناشر

مدنی دار التالیف بجنور۔ یوپی

نام کتاب :- تقصیرات تفہیم
مولف :- مفتی عزیز الرحمٰن
ناشر :- مکتبہ عبادیہ ہلدور ضلع بجنور۔ یوپی
سن طباعت :- ۱۹۷۹ء
تعداد اشاعت :- ۱۰۰۰
کتابت :- محمد سلیم قاسمی دیوبند
صفحات :- ۲۴۰
قیمت مجلد :- ۱۹ روپے

ملنے کے پتے

۱۔ مدنی دارالتالیف۔ بجنور۔ یوپی
۲۔ مکتبہ تجلی۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور
۳۔ کتب خانہ عزیزیہ۔ جامع مسجد۔ دہلی
۴۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو " "
۵۔ مکتبہ اشاعت العلوم۔ سہارنپور۔ محلہ مفتی ٹولہ۔

(نعمانی پریس دہلی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیات

حامداً ومصلیاً۔ امّا بعد۔

یہ کتاب قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلے میں میری ایک کوشش ہے جس کا خیال مجھے کافی عرصہ سے تھا لیکن اس کے لئے کوئی موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ اتفاق سے مجھے اپنی کتاب "تاریخ الاحکام" کے لکھنے کا موقعہ مل گیا اس کی ترتیب میں میں نے بہت تفاسیر کا مطالعہ کیا۔ ان میں سے تفہیم القرآن بھی ہے۔ اس کو میں نے ایک مرتبہ تو اس وقت اور دوسری مرتبہ یہ کتاب لکھتے ہوئے بہت غور سے پڑھا میرے نزدیک یہ کتاب خالی از فائدہ نہیں ہے بہت قیمتی مباحث اس کتاب میں آگئے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس میں غلطیاں نہ ہوں۔

متعدد اسفار کے دوران اور سائلین کے جواب میں مجھے اس کی ضرورت پیش آئی کہ فرداً فرداً کہاں تک جواب دیا جائے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھدی جائے۔

اسفار میں مجھے بکثرت ایسا سابقہ پیش آیا ہے کہ تفہیم القرآن کے پڑھنے والے دوسرے علمار کی صحیح بات کو اور تفہیم القرآن کی غلطی کو غلطی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ اس پر گرفت کرنے والوں کی توہین تک کر بیٹھتے ہیں۔ مودودی صاحب کے بارے میں عقیدت کا یہ غلو بہرحال کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ یہی غلو مودودی صاحب کی زبان میں ذہنی

غلامی کہلاتا ہے۔ انہوں نے دوسروں کی ذہنی غلامی کو توڑ بنائے تقلید بنالیا
لیکن اپنے معتقدوں کے بارے میں کوئی راہ اختیار نہیں کی بلکہ اس
کی دعوت دی ہے (جیسا کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک
جگہ سامنے آئیگا۔

بہرحال تفہیم القرآن کا جائزہ لینا کوئی معمولی کام نہ تھا چاہیئے
تھا کہ یہ کام بہت پہلے ہوجاتا اور کوئی ادارہ اس خدمت کو انجام
دیتا لیکن دوستوں کے اصرار پر یہ خدمت اس حقیر کے حصہ میں آئی
اب معلوم نہیں کہ میں نے کس حد تک تنقید و جائزہ کا حق ادا کیا ہے اور
کس حد تک کوتاہی کی ہے۔ اللہ تعالےٰ ہی سے اپنی کوتاہیوں کے بارے
میں معافی چاہتا ہوں اور صواب پر اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

مقدمہ

تفہیم کے اصول | جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی کتاب تفہیم القرآن کے تین بنیادی اصول ابتدائے کتاب میں ذکر فرمائے ہیں:-

۱- میں نے اس کتاب میں ترجمہ کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

۲- اس کام میں میرے پیش نظر علماء اور محققین کی ضروریات نہیں ہیں اور نہ ان لوگوں کی ضروریات ہیں جو عربی زبان اور علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد قرآن مجید کا گہرا تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ایسے حضرات کی پیاس بجھانے کے لئے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔

۳- میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں الخ

ان تینوں بنیادی چیزوں میں تیسرا اصول دراصل پہلے اصول کی توضیح اور تشریح ہے ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے لئے یہ اصول کیوں منتخب کئے ہیں کیونکہ

"فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

اسلئے اگر مودودی صاحب کے ترجمے یا بقول ان کے ترجمانی پر کوئی اعتراض کیا جائے تو سمجھ دار ناظر اور اہل مطالعہ یہی کہینگے کہ مودودی صاحب پر اعتراض کے بجائے یہ ناقد کی کم فہمی کی بات ہے کیونکہ مودودی صاحب نے تو اصول ۱۲ میں واضح طور پہ بیان کردیا ہے اسلئے ان کی کتاب پر اعتراض بے محل اور لایعنی ہے اسلئے کہ جس کتاب کے مخاطب اہل علم نہیں ہیں تو وہ خواہ مخواہ کیوں ٹانگ اڑاتے ہیں اسلئے اگر مودودی صاحب درمیان میں یہ بات نہ کہتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کے ترجمہ بالفاظ دیگر ترجمانی کے تعاقب اور گرفت میں تفہیم القرآن کی تقصیرات بیان کرنے میں چھ جلدوں کی بجائے بارہ جلدیں (یعنی دوچند) لکھنا پڑتیں کیونکہ اصل (تفہیم القرآن) کی خامی پر نشاندہی اور پھر اس خامی اور تقصیر پر دلائل دیکر اس کو خامی اور تقصیر ثابت کرنا اس سے کام یقیناً بڑھ جاتا اسلئے پہلے اصول کا صرف مختصر جائزہ لیکر ہم اس سے صرف نظر کرینگے مودودی صاحب نے سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت کا ترجمہ یا ترجمانی یہ کی ہے

۱۔ تعریف اللہ ہی کے لئے جو کائنات کا رب ہے (مودودی صاحب)

اس کے بعد ان مترجمین کے ترجمے ملاحظہ فرمائیں جنہوں نے آزاد ترجمے نہیں کئے ہیں

۲۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا۔ (شیخ الہندؒ)

۳۔ سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے (مولانا تھانویؒ)

۴۔ سب تعریف واسطے اللہ کے پروردگار عالموں کا۔ (شاہ رفیع الدینؒ)

۵۔ سب تعریفیں اس خدا کو لائق ہیں جو تمام عالموں کا رب ہے۔ (مولانا احمد سعید)

یہ پانچوں ترجمے دراصل اس آیت پاک کے ہیں۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔"

اس وقت ہمارے پاس اتفاق سے یہی چند ترجمے تھے۔ ان میں اور مولانا مودودی صاحب کے ترجمے میں الفاظ اور عبارت کے اعتبار سے فرق تو معمولی اردوداں حضرات جان لینگے۔ لیکن ان ترجموں میں کس میں کیا نقص ہے اس کو جب تک نہ بتلایا جائے اسوقت تک سمجھ میں نہ آئیگا۔

یاد رکھنا چاہیئے سب حضرات نے اس جگہ ترجمہ کرنے میں الحمد میں الف لام کو نظر انداز نہیں کیا کیونکہ کلام الٰہی میں کوئی حرف بے فائدہ استعمال نہیں ہوا ہے اسلیئے مودودی صاحب کے علاوہ سب حضرات نے ترجمہ کرنے میں الف لام معرفہ جو کہ اس جگہ استغراق کا فائدہ دے رہا ہے یعنی تمام تعریفیں، سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں یعنی حمد اور تعریف کی کوئی قسم اور کوئی جزو ایسا نہیں ہے جو رہ جائے وہ سب ذات باری تعالیٰ شانہ کے لیئے ہے جمہور امت میں سے اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور لِلّٰہ میں لام تخصیص کے لیئے ہے جس کا ترجمہ سب نے "لیئے" اور "واسطے" کیا ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے آزاد ترجمانی میں کلام الٰہی کے اس اعجاز اور منشائے ربانی کو نظر انداز کر دیا ہے اور فرمایا ہے:۔

"تعریف اللہ ہی کے لئے"

اگر کسی آدمی کو یہ معلوم نہ ہو یا کوئی غیر مسلم عربی داں ہو اور اس سے کہا جائے کہ اردو کے اس جملہ کو صحیح عربی زبان کا لباس پہنا دیجئے تو وہ اس کا ترجمہ یہ بھی کرسکتا ہے:۔

لَا حَمْدَ اِلَّا لِلّٰہِ — تعریف اللہ ہی کے لئے ہے [1]

مولانا کے ترجمہ میں چونکہ حصر موجود ہے اور حصر کے لئے عربی زبان

[1] یہ ترجمہ اس وجہ سے ہے کہ اِلَّا کی وجہ سے حصر پیدا ہو گیا ہے جو نفی کیساتھ حصر کا فائدہ دیتا ہے

میں اِلاّ یا اس کا ہم جنس کوئی حرف آتا ہے۔ کلام الٰہی کا منشا صرف اس قدر ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور مولانا مودودی صاحب نے اسکو حصر میں تبدیل کر دیا ہے یعنی تعریف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔ اس کے بعد پانچوں ترجموں کو پھر ملاحظہ فرمائیے تو یہ چیزیں ثابت ہونگی۔

ا۔ مولانا مودودی صاحب کے ترجمہ کا مفہوم مخالف یہ ہوگا کہ غیر اللہ کی تعریف جائز نہیں ہے۔ حالانکہ رات دن، ماں باپ، استاذ کسی صاحب کمال، ولی، رسول، صحابہ کی تعریفات کی جاتی ہیں

ب۔ دیگر تراجم کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ سب تعریفیں تو اللہ کے لئے ہیں البتہ بعض تعریفیں دوسروں کے لئے بھی ہیں اس سے فرق یہ ظاہر ہوگا کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کی تعریفیں اس حد تک نہ ہوں کہ شرک لازم آجائے۔

اس تفصیل سے ناظرین کرام پر آزاد ترجمانی اور دیگر ترجموں کا فرق ظاہر ہو گیا ہوگا۔ اگر مودودی صاحب تیسرا اصول بیان نہ کر دیتے تو پھر ہمارے لئے بہت مشکل ہو جاتی اور یقیناً ہم کو تفہیم القرآن سے زیادہ ضخیم کتاب ترتیب دینی پڑ جاتی۔ اصول نمبر۳ سے ہمارا کام آسان ہو گیا اسلئے مولانا کی آزاد ترجمانی کی گرفت اور تعاقب اسی ابتدا پر قیاس کیجائے ہماری اس کتاب کا مبنیٰ مودودی صاحب کا تیسرا اصول تفہیم ہے یعنی وہ کیا سمجھے ہیں اور کیا سمجھانا چاہتے ہیں

ترجمہ اور ترجمانی

آزاد ترجمانی کا ہرگز وہ مطلب نہیں ہے جو کہ آزاد ترجمانی والے جملہ سے شبہ ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ قرآنی متن کے الفاظ کی پابندی نہ کرتے ہوئے بامحاورہ اور عبارت کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمہ کرنا حقیقتہً یہ ترجمہ

نہیں بلکہ ترجمانی ہے اور ترجمانی میں اس قدر گنجائش ہے جس قدر ترجمہ میں تنگی ہے۔ ترجمانی کا دامن بہت وسیع ہے جبکہ ترجمہ کا دامن تنگ ہے۔ ترجمہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے جبکہ ترجمانی زبان کی معمولی واقفیت کے ساتھ بھی کی جا سکتی ہے اور یہ چیزرات دن مشاہدے میں آتی رہتی ہے۔

ہندوستان میں اردو تراجم قرآن پاک کی ابتداء خاندان شاہ ولی اللہؒ کے زمانے سے ہوئی اسوقت کی اردو کو دیکھا جائے اور موجودہ زمانہ کی اردو کو دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق ہے اس خاندان میں شاہ عبدالقادر صاحب نے اردو زبان میں ایسا ترجمہ کر دیا کہ اس سے زیادہ بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور آج کی ترقی یافتہ اردو میں بھی اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے زبان اور محاورہ میں امتداد زمانہ کے اعتبار سے جو فرق پیدا ہو گیا ہے اسکو حضرت شیخ الہندؒ نے انتہائی شستہ اردو زبان میں ڈھال دیا ہے۔

آزاد ترجمانی جو مودودی صاحب کی مراد ہے اس کی مثالیں ہیں ڈپٹی نذیر احمد صاحب، سر سید احمد خاں صاحب اور مولانا آزاد کے تراجم میں ملتی ہے ان حضرات نے ترجمہ نہیں بلکہ ترجمانی ہی کے رنگ کو اختیار کیا ہے چنانچہ یہ حضرات قوسین میں ایک آدھ لفظ ہی نہیں بلکہ جملوں کا اضافہ کر کے ترجمہ کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کے ترجمہ میں اگرچہ ایسی زبان درازی تو نہیں ہے لیکن ہے، اسی کا نام غالباً آزاد ترجمانی رکھا گیا ہے۔

اس آزاد ترجمانی سے جہاں فوائد ہیں وہاں نقصانات بھی ہیں اور یہ نقصان کیا کم ہے کہ جب کوئی ان تراجم کو انگریزی یا کسی زبان میں ترجمہ کرنا چاہے گا تو وہ قرآن پاک کا ترجمہ نہ ہوگا بلکہ تفہیم القرآن یا ترجمان القرآن

کا ترجمہ ہوگا اور سمجھا جائیگا کہ وہ قرآن پاک کا ترجمہ ہے، بالآخر ترجمہ در ترجمانی کا سلسلہ جب آگے بڑھے گا تو غیر قرآن کا تعارف اس طرح ہوگا کہ وہی قرآن ہے

یہ ضرور ہے کہ تفہیم القرآن میں ترجمان القرآن کیطرح زبان اردو کا شباب نظر آتا ہے لیکن مقصود یہ نہیں ہے مقصود ہے قرآن پاک کی تفہیم یا قرآن پاک کی ترجمانی، سو ہماری رائے یہ ہے کہ مولانا کی ترجمان القرآن اور مودودی صاحب کی تفہیم القرآن نے بہت جگہ قرآن پاک کی تفہیم و ترجمانی نہیں کی ہے بلکہ اپنے تاثرات کو ناظرین پر تھوپنے کی کوشش کی ہے اور ایسی مثالیں بہت ہیں اور تقریباً کوئی سورت ان مثالوں سے خالی نہیں ہے۔

تالیف تفہیم کا پس منظر

تفہیم القرآن ہو یا ترجمان القرآن یا کوئی اور تالیف اس کا وجودی پس منظر اگر نہ بھی بیان کیا جائے تب بھی اس کا مؤلف یا مصنف کچھ ایسے بنیادی اشارے اپنی تالیف میں پھیلا دیتا ہے کہ غور و فکر سے پڑھنے والا ٹھٹک کر گذرتا ہے تفہیم القرآن کے مطالعہ نے ہمیں اپنا پس منظر بتلانے میں کافی رہنمائی کی ہے چنانچہ سورۂ بقرہ شروع کرنے پر جب ہم قصۂ ہاروت و ماروت پر پہونچے اور ان پیراگرافوں کو ہم نے پڑھا (جن کو ہم نے نقل کیا ہے) تو ہم اس جگہ کے تضاد کو دور نہ کر سکے۔ ہم نے غور کیا کہ یہ شخص اس باب میں اسرائیلیات کی نہایت شد و مد کے ساتھ تردید بھی کر رہا ہے لیکن ہاروت و ماروت کو دو فرشتے مان کر وہی تعارف کرا رہا ہے جو تعارف کوئی اسرائیلی روایت کرا سکتی ہے تب ہم نے مولانا آزاد کی ترجمان القرآن اور مولانا عبد اللہ عمادی کی تحریرات اور بعض تالیفات کی طرف رجوع کیا اور پھر ہم نے جہاں کہیں بھی جدید محققین کا لفظ دیکھا اور اس جگہ ان دو حضرات کی تالیف کی طرف رجوع کیا تو ہمارے

شکوک نے اپنا لباس اتار کر یقین کا لباس پہن لیا۔

یہ عبداللہ عمادی کون بزرگ ہیں؟ یہ جونپور کے باشندہ تھے اور شیخ عماد یمانی کسی بزرگ سے خاندانی نسبت رکھتے تھے اسی نسبت سے یہ اپنے کو عمادی لکھتے تھے نام عبداللہ تھا یہ ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ آگئے تھے اور یہیں کے ہو رہے۔ لکھنؤ میں فرنگی محلی میں تعلیم حاصل کی شعر سخن اور خاص طور سے تاریخ گوئی سے کافی دلچسپی تھی۔

جب مولانا آسی نے لکھنؤ میں اصح المطابع قائم کیا (جس کا نام بعد میں آسی پریس ہو گیا تھا) اس میں کتابوں کی تصحیح کیا کرتے تھے اور اس میں انکو بڑی مہارت حاصل ہو گئی تھی اور خاص طور سے مولانا آسی کی توجہات سے ان میں کتب بینی کا شوق پیدا ہوا اور آگے چلکر وہ ذی استعداد علماء میں شمار ہونے لگے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا آسی نے "البیان" نام سے ایک عربی اور اردو ماہنامہ نکالا جس میں ایک طرف عربی اور دوسری طرف اردو ہوتی تھی اور آخر میں چند صفحے عربی ممالک کی خبروں کے ہوتے تھے۔ (راقم الحروف نے اس کے متعدد شمارے پڑھے ہیں) اس کی بدولت ان کو جدید عربی کے نئے الفاظ سے پوری واقفیت ہو گئی تھی۔

۱۹۰۶ء میں جب مولانا آزاد الندوہ کے ایڈیٹر تھے تو مولانا عمادی اس کے سب ایڈیٹر تھے۔ جب مولانا آزاد ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں امرتسر سے "وکیل" کی ایڈیٹری چھوڑ کر کلکتہ آگئے تو مولانا عمادی صاحب وکیل کے ایڈیٹر ہو گئے وہاں انہوں نے سرسید کے تہذیب الاخلاق کو پھر زندہ کیا اور اس کے کئی نمبر نکالے ۱۹۱۴ء میں مولانا حالی کی وفات کے بعد زمیندار کے ایڈیٹر ہوئے اور پھر ظفر علی خاں کے توسط سے دار الترجمہ والتالیف حیدرآباد میں ملازم ہو گئے وہاں انہوں نے تاریخ طبری،

طبقات ابن سعد وغیرہ ضخیم کتابوں کے ترجمے کئے اسی دارالترجمۃ والتالیف میں برسہابرس مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے کام کیا ہے اور مولانا عمادی صاحب کے علوم سے استفادہ کیا ہے، اسلئے وہ مجدید محققین کہہ کر کسی مسئلہ کو نہیں سمجھاتے بلکہ مولانا عمادی اور مولانا آزاد پر نقد کرتے ہیں۔ اس نقد میں انہوں نے بعض مسلمات سے انحراف بھی کیا ہے مثلاً نمرود اور فرعون کے منکر خدا ہونے سے انکار وغیرہ

مولانا مودودی صاحب نے قلمی معاملہ میں جم کر ابوالکلام کو پڑھا ہے چنانچہ ان کی روانی اور تحریر میں بعض جگہ نہیں اکثر و بیشتر مولانا آزاد کے جملے نہیں بلکہ سطریں کی سطریں مل جاتی ہیں ان کو اگر نقل نہ کہا جائے تو اقتباس کی پختگی اور اخذ کا جادو ضرور کہا جائیگا اس کا ثبوت ہمارے پاس مولانا آزاد کی ترجمان میں قصہ ذوالقرنین، قصہ اصحاب کہف اور صلوٰۃ وسطیٰ کی بحث ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ مودودی صاحب خالی ان کے خوشہ چین ہیں بلکہ ان پر انہوں نے نہایت فراخدلی کے ساتھ نقد بھی کیا ہے چنانچہ قصہ ہاروت وماروت (جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں) وہ انہوں نے جناب عبداللہ عمادی اور مولانا آزاد کی ضد میں لکھا ہے جب تردید ہی ٹھہری تو صحیح بات کی غلط بات سے بھی تو تردید ہو جاتی ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تردید میں انہوں نے یہی رنگ اختیار کیا ہے، جدید محققین کہہ کر انہوں نے سورہ نمل میں مولانا آزاد اور غالباً مولانا عمادی کی اچھی عمدہ تردید کی ہے اور قرآن پاک کی تفہیم ان کے مقابلہ میں ایسی ہی کی ہے جیسی کرنا چاہیے۔ مولانا آزاد نے تو آزاد ہو کر اس جگہ ترجمان القرآن میں تحریف القرآن کر ڈالی ہے اور مودودی صاحب نے ان کو برمحل اور بروقت ٹوکا ہے۔ ابوالکلام اور ترجمان سے مودودی صاحب کا ربط و تعلق

کو ہم نے بعض جگہ حاشیہ میں اور بعض جگہ اقتباسات میں ظاہر کیا ہے مثلاً الصلوٰۃ الوسطےٰ کی تشریح وہ صلوٰۃ جو محاسن صلوٰۃ کو جامع ہو اس میں مودودی صاحب مولانا آزاد کے خوشہ چین ہیں۔

تفسیر کی بنیادی پالیسی

تفہیم القرآن کی بنیادی پالیسی سے مراد وہ امور ہیں جن کو مودودی صاحب نے بکثرت بیان کیا ہے جہاں بھی ذرا سا موقع ملا وہیں اس پر اچھی خاصی بحث چھیڑدی خاص طور سے

۱۔ قصہ نمرود اور فرعون میں بہت جگہ بلکہ جتنی جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ آیا ہے وہاں انہوں نے یہ ضرور کہا ہے مثلاً

ا۔ نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سیاسی جرم بغاوت میں نکالا تھا

ب۔ نمرود کو اللہ تعالےٰ کی الوہیت کا انکار نہیں تھا۔

ج۔ فرعون تو اپنی سیاسی ربوبیت خداوندی کا مدعی تھا وہ اللہ تعالےٰ کا منکر نہ تھا۔

د۔ ہلاک ہونے والی قومیں منکرین خدا نہیں تھیں بلکہ وہ کافر و مشرک تھیں

س۔ یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت میں شک نہ تھا اسی نوعیت کے ہزارہا جملے نہیں بلکہ مسلسل عبارتیں ان کی تشریحات میں پائی جاتی ہیں

۲۔ مدینہ کی اسلامی ریاست

۳۔ مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت اسلامی

۴۔ مشرکین تحریک اسلامی کو دبانا چاہتے تھے۔

۵۔ فلاں قوم فلاں رسول کی لیڈری سے انحراف کررہی تھی۔

اس قسم کے ہزارہا جملے ان کی تفسیر میں ملتے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ

وہ ایک پنتھ دو کاج کے فلسفہ پر عمل کرنا چاہتے ہیں ہم نے اپنی تنقید میں اس قسم کی عبارتوں پر کوئی تنقید نہیں کی ہے البتہ انہوں نے جہاں کہیں مذکورہ امور میں سے کسی پر دلائل کے ساتھ بحث کی ہے مثلاً قصہ نمرود اور فرعون میں تو ہم نے ان کا تعاقب کیا ہے اور جس زمین پر کھڑے ہو کر انہوں نے اعلان کیا ہے ہم نے بھی ان کو للکارا ہے ہم نے بہت غور کیا کہ اس قسم کی باتوں کو بار بار اصرار کے ساتھ بیان کرنے سے ان کا مقصد کیا ہے ؟ ممکن ہے اس قسم کے مفروضات کو بڑھا وا دیکر بحث کا میدان کھڑا کر دیا ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے پس منظر میں حیدرآباد کی کوئی مجلس مذاکرہ ہو جس کو انہوں نے اتنی اہمیت دی کہ اپنی تفسیر کا معتد بہ حصہ اسی پر خرچ کر دیا اور بہت ممکن ہے کہ پاکستان میں صدر ایوب خاں سے عناد اور مخالفت کی وجہ سے وہ ایسا لکھنے پر مجبور ہوئے ہوں کیونکہ صدر ایوب خاں نے امریکہ کو للکارا تھا جبکہ مودودی صاحب کو اچھی خاصی ایڈ وہاں سے ملتی تھی اسی وجہ سے ایوب خاں نے ان کو جیل میں ڈال دیا تھا اور مودودی صاحب نے اپنی حکومت الہٰیہ کا صدر مملکت کے لئے مس فاطمہ جناح کا الیکشن لڑا تھا۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات میں منتشر ان عبارتوں کو بھی اس جگہ جمع کر دیا جائے جو ہمارے نزدیک ہی نہیں ہمارے علماء کو کھٹکی ہیں اور ان پر تنقید کی گئی ہے مثلاً

چند اقتباسات

مودودی صاحب سے اپنی تالیفات اور علمی کوششوں میں ایسی فروگذاشتیں کیوں ہوئی ہیں اسکے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ زمانہ تحصیل علم (ابتدائی دور میں) کسی زبان کے محاسن سے واقف ہونے کے لئے جس تمرین و تربیت کی ضرورت پیش آتی ہے یہ زمانہ سرے سے ان کو دستیاب

ہی نہیں ہوا محض عربی لٹریچر کے مطالعہ سے جو رسوخ حاصل ہوا ہے اسی کو انہوں نے تحصیل قرار دے کر عمارت بنانی شروع کردی حالانکہ یہ تجرباتی حقیقت ہے کہ زندگی میں ہزاروں موڑ ایسے آتے ہیں کہ جہاں بالغ النظر رہنماؤں کو بھی مشورہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی علمی کاوشوں کا معاملہ ہے جو آدمی بھی مشورہ سے اپنے کو بے نیاز سمجھے گا وہ یقیناً ٹھوکر کھائے گا۔ اسلئے ہمارا خیال ہے کہ عدم تربیت اور غرور یہ معلومات نے مودودی صاحب کو بھٹکا دیا ہے۔

سطور ذیل میں مودودی صاحب کی متفرق کتابوں سے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں ان کو قارئین کرام نے اگر ذہن میں رکھا تو انکو تقصیرات تفہیم اور تفہیم القرآن کے پڑھنے میں اچھی خاصی مدد ملے گی۔

۱۔ "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے نہ کسی کو تنقید سے بالاتر سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر کو خدا کے بتائے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے، اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے"

(مودودی مذہب ص۵۳)

۲۔ موسیٰ علیہ السلام کی مثال اس جلد باز فاتح کی سی ہے جو اپنے اقتدار کا استحکام کیے بغیر مارچ کرتا ہوا چلا جائے اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقہ میں بغاوت پھیل جائے۔

(مودودی مذہب ص۲۳)

۳۔ پیغمبروں تک کو اس نفس شریر کی رہزنی کے خطرے پیش آئے ہیں چنانچہ داؤد علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقعہ پر تنبیہ کی گئی کہ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورۂ ص رکوع ۲) ہوائے نفس کی پیروی نہ

کرنا ورنہ یہ تمہیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی (صلا ۲)

۴۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متاثر ہو کر اوریا سے طلاق کی درخواست کی تھی (ص ۲۲)

۵۔ حضرت داؤد کے فعل میں خواہش نفس کا کچھ دخل تھا اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا (ص ۲۵)

۶۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی بشری کمزوریوں سے مغلوب اور جاہلیت کے جذبہ کا شکار ہو گئے تھے (مودودی مذہب ص ۲۹)

۷۔ عصمت دراصل انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں ہے۔ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بھی بشر ہیں۔ (ص ۳۰)

۸۔ انبیاء کرام سے قصور بھی ہو جاتے تھے اور انہیں سزا تک دی جاتی تھی (ص ۳۱)

۹۔ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا (ص ۳۵)

۱۰۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کرجاتے تھے (یہ پوری عبارت مودودی مذہب ص ۵۶ میں پڑھ لیں، آگے کی عبارت نقل کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے)

۱۱۔ صحابہ کرام رضؓ جہاد فی سبیل اللہ کی اصلی اسپرٹ سمجھنے میں بار بار غلطیاں کرجاتے تھے۔ (ص ۵۹)

۱۲۔ ایک مرتبہ صدیق اکبر رضؓ جیسا بے نفس متورع اور سرا پا للّٰہیت بھی اسلام کے نازک ترین مطالبہ کو پورا کرنے سے چوک گیا (ص ۶۰)

۱۳۔ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی) شخصی عظمت نے رحلت مصطفوی کے وقت اضطراری طور پر حضرت عمر رضؓ کو تھوڑی دیر کے لئے مغلوب کر لیا تھا (مودودی مذہب ص ۶۰)

۱۴۔ حضرت عثمان رضؓ جن پر اس کار عظیم (خلافت) کا بار رکھا گیا تھا ان خصوصیات کے حامل نہ تھے جو اُن کے جلیل القدر پیشروؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ (ص ۶۵)

۱۵۔ خلفائے راشدین کے فیصلے بھی اسلام میں قانون نہیں قرار پا سکتے جو انہوں نے قاضی کی حیثیت سے کئے تھے (ص ۶۶)

۱۶۔ حضرت عثمان رضؓ نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدف تنقید بن کر رہیں (ص ۱۰۷)

۱۷۔ مثال کے طور پر انہوں نے افریقہ کے مال غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) مروان کو بخش دیا (ص ۱۰۷)

۱۸۔ اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ دو چیزیں ایسی تھیں جو بڑے دور رس اور خطرناک نتائج کی حامل ثابت ہوئیں۔ (ص ۱۰۷)

۱۹۔ دوسری چیز جو اس سے زیادہ فتنہ انگیز ثابت ہوئی وہ خلیفہ (حضرت عثمان رضؓ) کے سکریٹری کی اہم پوزیشن پر مروان ابن الحکم کی مامورت تھی (ص ۱۰۷)

۲۰۔ تاریخ بتاتی ہے اور صحیح بتاتی ہے کہ مروان اور یزید امتِ مسلمہ کے نزدیک ناپسندیدہ شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں۔ یہ نرم سے نرم الفاظ ہیں جو مروان اور یزید کے بارے میں کہے جاسکتے ہیں

(ماہنامہ فاران ص۲۲ ستمبر ۶۹ء)

۲۱۔ حضرت عثمان رضؓ کی پالیسی کا پہلو (جو فقرہ ۱۷۔ ۱۸ میں نقل ہوا)۔ بلاشبہ غلط تھا، اور غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ کسی نے کیا ہو۔ اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضہ ہے اور نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے[1]

(مودودی مذہب ص۱۰۷)

۲۲۔ ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ رضؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے ۔۔۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ (ص۵۹)

۲۳۔ زیاد بن سُمَیّہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہ رضؓ کے ان افعال میں سے ہے جنہیں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی[2] (ص۹۶)

---

[1] اور "اشرف الصحابی" کا مطلب کیا ہے۔

[2] غالباً اسی سنت کی تقلید میں مودودی صاحب نے بھی فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔

۲۴۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنا حامی اور مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں[1] اور اس کا ثبوت بہم پہنچا کر کہ زیاد انہی (ابوسفیانؓ) کا ولد الحرام ہے پھر اسے اسی بنیاد پر اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دیدیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے، مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا، کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا (مودودی مذہب ص۷۷)

۲۵۔ حضرت عمرو بن العاص رضؓ سے دو کام ایسے سرزد ہو گئے ہیں جنہیں غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے (ص۸۲)

۲۶۔ حضرت علی رضؓ نے مالک بن حارث الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری تک کے عہدے دے دئے، درآنحالیکہ قتل عثمان رضؓ میں ان دونوں صاحبوں کا جو حصہ تھا وہ سب کو معلوم ہے، حضرت علی رضؓ کے پورے زمانہ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام[2] ایسا نظر آتا ہے جس کو غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں (ص۸۵)

۲۷۔ حضرت عائشہ رضؓ و حضرت حفصہ رضؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کچھ زیادہ جری ہو گئی تھیں، اور حضورؐ سے زبان درازی کرنے لگی تھیں (ص۸۸)

۲۸۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز رحؒ اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (ص۹۱)

۲۹۔ امام غزالیؒ کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص

---

[1] زناکاری پر شہادتیں لینا؟ کیسا عجیب انکشاف ہے [2] جو ان کے پورے زمانہ خلافت پر پھیلا ہوا ہے

بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جاسکتے ہیں، ایک قسم ان نقائص کی ہے جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا ہوئے، دوسری قسم ان نقائص کی جو انکے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے اور تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے

(ص۹۲)

۳۰ — پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی رح کے وقت سے شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خلفاء کے تجدیدی کام میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا، اور انکو پھر وہی غذا دیدی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی (ص۹۲)

۳۱ — اسی طرح یہ قالب (تصوف) بھی مباح ہونے کے باوجود اس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہوگیا ہے کہ اس کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکہ لگایا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی ان "مزمن مریضوں" کو پھر وہی "چنیا بیگم" یاد آجاتی ہے جو صدیوں سے ان کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہے (ص۹۲)

۳۲ — مسلمانوں کے اس مرض سے نہ حضرت مجدد صاحب ناواقف تھے، نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید بھی موجود ہے۔ مگر غالباً اس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دی جو اس مرض میں "مہلک" ثابت ہوچکی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسی پرانے مرض سے متاثر ہوتا چلا گیا۔

(ص۹۳)

۴۳۔ اگرچہ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی جو ابن تیمیہ نے کی تھی، لیکن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود ہی تھا جس کا کچھ اثر شاہ اسماعیل شہید رح کی تحریروں میں بھی باقی رہا، اور پیری مریدی کا سلسلہ سید صاحبؒ کی تحریک میں چل رہا تھا، اس لیے مرض صوفیت کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی۔

(مودودی مذہب ص۹۵)

۴۴۔ اور یہی جہالت، ہم ایک نہایت قلیل جماعت[1] کے سوا مشرق سے لیکر مغرب تک مسلمانوں میں عام دیکھ رہے ہیں خواہ وہ اَن پڑھ عوام ہوں یا دستار بند علماء، یا خرقہ پوش مشائخ، یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات۔ ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں سب یکساں ہیں۔ (ص۱۹)

تنقیدات مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں یہود اور نصاریٰ پر کلام کرتے ہوئے سینکڑوں جگہ ان کے پادریوں۔ راہبوں اور پروہتوں پر اس طرح تنقید نہیں کی کہ وہ ان ہی پر تنقید شمار ہوتی بلکہ تنقید تو ان پر کی ہے لیکن نام اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لئے ہیں مثلاً علماء، فقہاء، مجتہدین، صوفیاء، پیر و فقیر وغیرہ۔ حالانکہ ایک جگہ اس حقیقت کا اعتراف بھی کر لیا ہے کہ رہبان اور احبار یہود و نصاریٰ کے علماء کے لئے خاص ہیں ہم نے اس کی بھی کوئی تنقید نہیں کی ہے کیونکہ یہ دوسروں کی بلا اپنے سر لینے کے مترادف ہے۔ ہم اگر کسی آدمی

---

[1] غالباً مودودی صاحب کی اپنی جماعت۔

کی مذمت کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں آدمی کینہ اور عناد میں کالی بھینس ہے۔ اس جملے سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں ایک تو اس آدمی کی مذمت دوسرے کالی بھینس کی برائی یہی حال مودودی صاحب کی تنقید کا ہے۔

ہم موجودہ زمانہ کے نام نہاد اور اصطلاحی مولانا اور مبلغین اور پیروں کا دفاع نہیں کرتے ہیں اسی وجہ سے ہم نے اپنی تنقیدات میں اسکو ہاتھ تک نہیں لگایا کیونکہ ان نام نہاد لوگوں کے پاس نہ علم ہے اور نہ دین یہ تو بازاری دوکانداروں کیطرح ہیں جو ہر طرح پیسہ بٹورنا چاہتے ہیں اور اپنے گاہکوں کی ایک بھیڑ اکٹھا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ شکایت ہے کہ تنقید میں صحیح اور غلط لوگوں میں کوئی خط فاصل ضرور ہونا چاہیئے تھا۔

ہماری تنقید کی بنیاد

ہماری تنقید کی بنیاد اس کتاب میں مودودی صاحب کا عطا کردہ تیسرا اصول ہے کہ انہوں نے براہ راست عبارت قرآن سے کیا سمجھا ہے یا عبارت قرآن پر غور و فکر کرنے کے بعد ان کے قلب پر کیا اثر پڑا ہے ان کی تشریحات اور ترجمانی کو ہم نے اسی نقطۂ نظر سے پڑھا ہے۔ اور علماء تفسیر نے جو اصول بیان کئے ہیں ان پر پرکھا ہے وہ چند اصول یہ ہیں

۱۔ قرآن پاک کی تفسیر قرآن ہی کے ذریعہ سے اور یہ تفسیر کا اعلیٰ درجہ ہے کیونکہ اگر کسی جگہ قرآن پاک میں اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی کوئی تفصیل ہے۔

۲۔ قرآن پاک کی تفسیر سنت شریفہ کے ذریعہ سے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم ایسا نہیں بیان فرمایا ہے جو آپ نے قرآن پاک سے نہ سمجھا ہو۔ اللہ تعالے نے ارشاد فرمایا ہے :-

۱۔ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتَابَ	ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری
لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا	تاکہ آپ لوگوں کے درمیان وہ

اَرٰىكَ اللّٰهُ	فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو بتلایا ہے
۲۔ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ	نہیں اتاری ہم نے آپ کی طرف مگر اسلئے کہ آپ بیان کریں ان سے جو مختلف ہیں اس میں ہدایت ہے اور رحمت ہے مومنین کیلئے
۳۔ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ	ہم نے قرآن کو آپ کی طرف اتارا تاکہ آپ لوگوں سے بیان کریں
۴۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى	اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے نہیں بلکہ وحی ہی کے ذریعہ کلام فرماتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو حکم یا جو معنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں وہ وہی ہیں جو قرآن پاک میں موجود ہیں آپ کے بیان اور قرآن میں صرف اس قدر فرق ہے کہ قرآن پاک وحی متلو ہے اور آپ کے بیان کردہ احکامات و معنی وحی غیر متلو ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

اِنِّىْ اُوْتِيْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ	مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے مثل اس کے ساتھ۔

اس سے مراد سنت شریفہ اور احادیث ہیں۔ اس کے بعد اگر کسی آیت کی تفسیر نہ تو قرآن میں ملے اور نہ سنت میں ملے تو اقوال صحابہ رض کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیونکہ یہ حضرات نزول قرآن کے بارے میں زیادہ واقف کار ہیں اور ان حضرات کے پاس فہم تام اور علم کامل اور عمل صالح ہے خاص طور سے خلفاء راشدین اور اجلہ صحابہ رض مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رض، ابن جریرؒ نے حضرت مسروق کی سند

سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا

قسم خدا کی قرآن پاک میں کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس کے بارے میں، میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور کہاں نازل ہوئی ہے اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں آدمی مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں زیادہ عالم ہے تو میں اس کے پاس سفر کر کے جاؤنگا

۲۔ حضرت ابن مسعودرضؓ نے فرمایا ہے کہ ہم میں ہر کوئی جس کو دس آیات قرآن معلوم ہوجاتی تھیں وہ اس وقت تک آگے نہ بڑھتا جب تک اس کو ان آیات کے معنی نہ معلوم ہوجائیں اور وہ ان پر عمل نہ کرلے۔

۳۔ حضرات صحابہ رضؓ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ بھی ہیں وہ ترجمان القرآن ہیں ان کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

اللّٰھُمَّ فقھه فی الدین	اے اللہ اسکو تفقہ فی الدین عطا
وعلمه التاویل	فرما اور تاویل (تفسیر قرآن) سکھا

ان کے بارے میں حضرت ابن مسعودرضؓ نے فرمایا ہے:۔

"ابن عباس اچھے ترجمان القرآن ہیں"

ان حضرات کے بعد حضرات تابعین کا نمبر ہے ان حضرات نے حضرات صحابہ رضؓ ہی سے سنکر معنی بیان کئے ہیں۔

۱۔ ان میں سے ایک صاحب اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدّی ہیں جو اکثر و بیشتر حضرت ابن مسعودرضؓ اور حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت نقل کرتے ہیں ان ہی سے وہ بعض اہل کتاب کے اقوال بھی روایت کرتے ہیں جنکو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مباح قرار دیا ہے

ارشاد فرمایا ہے

بلغوا عنی ولو آیۃ و	میری جانب سے پہونچاؤ اگرچہ
حدثوا عن بنی اسرائیل	وہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل
ولا حرج (رواہ بخاری)	سے روایت نقل کرو کوئی حرج نہیں ہے

لیکن ان اسرائیلیات کو بطور استشہاد کے تو پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں سے بعض سچی ہیں اور بعض جھوٹی اور بعض درمیانی ہیں۔

۲۔ ان ہی حضرات میں سے ایک صاحب مجاہد ہیں یہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضہ کو تین مرتبہ قرآن شریف اول سے لیکر آخر تک پڑھ کر سنایا اور ہر ہر آیت پر میں نے ان سے سوال کیا اور اس کے معنی دریافت کیے ہیں اسی وجہ سے سفیان ثوری نے ان کے بارے میں بیان فرمایا ہے

اذا جاءک التفسیر عن	جب کوئی تفسیر تمہیں مجاہد کی
مجاهد فحسبك به	ملے تو وہی کافی ہے۔

ان ہی حضرات میں سے سعید بن جبیر رح، عکرمہ مولی ابن عباس عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، مسروق، سعید بن مسیّب، ابو العالیہ ربیع بن انس، قتادہ، ضحاک، ابن مزاحم ہیں۔ ان حضرات کے اقوال میں بعض دفعہ تضاد بھی ہو جاتا ہے کیونکہ ان میں سے کوئی کسی اعتبار سے معنی بیان کرتا ہے اور کوئی کسی اعتبار سے اسوجہ سے سمجھدار آدمی کو ایسی جگہ غور و فکر سے کام لینا چاہیے شعبہ بن حجاج نے کہا ہے کہ فروعات میں تابعین کے اقوال میں اگر اختلاف ہو تو وہ ایک دوسرے پر حجت نہیں ہیں لیکن اگر یہ حضرات کسی چیز پر متفق ہوں تو پھر اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اختلاف کی صورت میں لغت قرآن لغت سنت اور لغت عرب کی طرف رجوع کرنا چاہیے

ابن کثیر از ص۳ تا ص۵ مختصراً

تفسیر قرآن پاک کا یہ وہ معیار ہے کہ جس پر مفسرین اور متقدمین حضرات قائم رہے ہیں۔ مفسرین حضرات نے بھی اگرچہ اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے بعض کی تفاسیر میں معقولات کا رنگ ہے بعض کی تفاسیر میں نحو وصرف اور ادب کا رنگ ہے بعض کی تفاسیر میں علم معانی وبیان کا رنگ ملتا ہے مگر یہ رنگ عبارت قرآن کے محاسن بیان کرنے کے لئے ہے۔ نفس تفسیر میں یہ حضرات مذکورہ اصولوں ہی کے پابند رہے ہیں یہ بات ضرور ہے کہ بعض نے کیف ما اتفق روایات کو لے لیا ہے اور روایتی معیار پر پرکھ کر نہیں دیکھا ہے۔ مودودی صاحب نے بھی ایک جگہ ان اصولوں میں سے بعض کو بیان کیا ہے:-

ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ سے زائد کوئی مطلب لینا چار ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے۔ یا تو قرآن ہی کی عبارت میں اس کے لئے کوئی قرینہ موجود ہو یا قرآن میں کسی دوسرے مقام میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہو یا کسی صحیح حدیث میں اس اجمال کی شرح ملتی ہو یا اس کا کوئی قابل اعتبار ماخذ ہو مثلاً تاریخ کا معاملہ ہے تو تاریخ میں اس اجمال کی تفصیلات ملتی ہوں یا آثار کائنات کا ذکر ہے تو مستند علمی تحقیقات سے اس کی تشریح ہو رہی ہو اور احکام شرعیہ کا معاملہ ہے تو فقہ اسلامی کے ماخذ اس کی وضاحت کر رہے ہوں جہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو وہاں محض بطور خود ایک قصہ تصنیف کر کے قرآن کی عبارت میں شامل کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے[1]

تفسیر قرآن پاک کے جو اصول ہم نے اوپر ذکر کئے ہیں ان کے پیش نظر ہم مودودی صاحب کے اس قاعدہ پر تنقید کر سکتے ہیں کیونکہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۳۲۲ ج ۴

اس قاعدہ کا اکثر حصہ خود ان کا مقرر کردہ ہے تاہم اس قاعدہ سے ایک بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان کا تیسرا اصول (جو ہم ذکر کر آئے ہیں) غالباً اسی روشنی میں ہے اگرچہ بہت جگہ وہ اپنے بیان کردہ قاعدہ سے ہٹ گئے ہیں مثلاً۔

۱۔ مودودی صاحب نے بہت جگہ سیاق و سباق کا نام لیا ہے لیکن اس سیاق سباق میں ان کی نظر صرف اسی صورت تک پہونچی ہے بہت کم انہوں نے دوسری آیات کو ذہن میں رکھا ہے مثلاً سورۂ نساء میں زنا کے ابتدائی حکم کے بارے میں لفظ فاحشہ کی تحقیق انہوں نے قرآن پاک میں دوسری جگہ تلاش نہیں کی

۲۔ اسی جگہ انہوں نے امام مسلم اصفہانی اور ابو عبدالرحمٰن سلمی پر تنقید بھی کی ہے۔ اور یہ خیال نہیں کیا کہ احکام شرعیہ کا معاملہ ہے اسوجہ سے اسلامی فقہ کے ماخذ[له] کو دیکھ لیا جائے۔

۳۔ ایسے ہی سجدہ تلاوت کو بلا وضو جائز قرار دیدیا ہے اور اجماع امت کی کوئی پرواہ نہیں کی اور وہاں سنت ثابتہ کا سہارا تلاش کرلیا حالانکہ ان کے پاس کوئی سنت ثابتہ دلیل میں نہیں ہے

۴۔ ایسے ہی اذان فجر کے بعد سحری کھانے کو جائز قرار دیدیا اور قطعاً صحیح احادیث اور اجماع امت کی پرواہ نہیں کی

۵۔ ایسے ہی قصہ ہاروت و ماروت میں قرآن پاک کی دوسری آیات سے کوئی مدد حاصل نہیں کی اور خود اس جگہ ایک مفروضہ بات پیش کردی

[له] اس جگہ اسلامی فقہ کا ماخذ عجیب سا جملہ استعمال کیا ہے مراد تو یہ ہے کہ احکامات میں اسلامی فقہ کی کتابوں کو دیکھا جائے لیکن جملہ دوسرے معنی بیان کرتا ہے یعنی اسلامی فقہ کا ماخذ کیا ہے یہی قرآن و حدیث۔ اسی قسم کے جملے ہزاروں ہیں جہاں وہ اپنا مقصد بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور گرفت سے بھی بھاگنا چاہتے ہیں۔

جس کے تسلیم کرنے کے لئے کسی اعتبار سے کوئی گنجائش نہیں

۶۔ ایسے ہی غزوہ خندق کے بارے میں جو آیات فرشتوں کے بارے میں آئی ہیں اس کی تشریح میں دوسری آیات کا لحاظ نہیں کیا۔

۷۔ جنگ بدر میں فرشتوں کے قتال کے بارے میں انکار کر دیا ہے

غرضکہ ان کے بیان کردہ قانون اور قاعدہ کے اعتبار سے ہی ان کی تشریحات میں تقصیرات بکثرت ہیں اگر وہ تیسرا اصول نہ بیان کرتے تو کسی کے لئے کیا موقع تھا سینکڑوں کتابیں غلط اور صحیح موجود ہیں کسی کو کیا سروکار لوگوں کو اختیار ہے کہ صحیح بات کو لیں اور غلط کو رد کر دیں۔ ان کا تیسرا اصول ہی ہمارے نزدیک ان تنقیدات میں بنیاد رہا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جن دلائل سے وہ گفتگو کر رہے ہیں (قرآن اور احادیث) انہی سے ان کی رائے پر نقد کیا جائے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ العزیز وباللہ التوفیق اس بارے میں ہم نے ایک صحیح اور مستند بات کی ہے

مودودی صاحب کی تاریخ دانی کا یہ عالم ہے کہ اکثر و بیشتر تو انہوں نے مولانا ابو الکلام آزاد کے حوالے از بائیبل، توریت، تلمود وغیرہ سے رہنمائی حاصل کی ہے لیکن اس میں وہ خالص ان کے مقلد نہیں ہیں بلکہ انکی اپنی تلاش و جستجو بھی ہے۔ اس بارے میں ہم یہی عرض کریں ہم ان چیزوں کی بنیاد پر اپنی صحیح روایات کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں

نقل اقتباسات

نقل اقتباسات میں ہم نے پوری احتیاط سے کام لیا ہے اگرچہ کسی جگہ اختصار بھی کیا ہے لیکن اس سے وہ موضوع ضرور سامنے آجاتا ہے جو باعث تنقید ہے اسلئے ناظرین کرام کو اس بارے میں نفس موضوع پر نظر رکھنا چاہیئے اور اس چکر میں نہ پڑنا چاہیئے کہ اس کا ماسبق اور مابعد کہاں ہے ہم نے جس موضوع پر گفتگو کی ہر اگر اس میں ہماری خیانت پکڑی جائے تو ہمیں ضرور مطلع کرنا چاہیئے اس

پر ہم رجوع بھی کرینگے اور معذرت بھی چاہینگے

جماعت اسلامی سے وابستہ بعض حضرات سے یہ اعتراض بھی سننے میں آیا ہے کہ یہ مولانا حضرات تو مودودی صاحب کے پیچھے محض سیاسی اختلاف کی وجہ سے پڑے ہوئے ہیں۔ ان حضرات نے مولانا آزاد کی ترجمان القرآن پر تنقید نہیں کی۔

ان سے گذارش ہے کہ مولانا آزاد کی ترجمان القرآن پر قصص القرآن میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے تنقید کی ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ پر مولانا تھانوی رحمہ نے تنقید کی ہے۔ علماء اپنے اس فریضہ سے غافل نہیں رہے۔ علاوہ ازیں مولانا آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ نے کبھی ایک اسکول اور مذہب کی صورت اختیار نہیں کی مودودی صاحب کی تحریروں نے تو مستقل ایک اسکول کو جنم دیا ہے اسلئے انکی گرفت کرنا ضروری ہے۔

آخر میں ہم مودودی صاحب کے معتقدوں کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ جو حضرات اسلامی علوم کی اصلی زبان سے واقف نہ ہوں اور صرف اردو یا انگریزی یا عربی کے علاوہ دیگر زبانوں کے ذریعہ مولانا بن گئے ہیں وہ ہماری اس کتاب پر تنقید کر کے وقت ضائع نہ کریں ہم صرف اہل علم کی تنقیدات پر غور کرینگے

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالٰے میری لغزشوں کو معاف فرمائے اور جو تحقیقی بات قلم سے لکھی گئی ہے اللہ تعالٰے اس پر اجر عطا فرمائے آمین وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

فقط والسلام

عزیز الرحمٰن غفرلہ

مدنی دار التالیف۔ مدنی دار الافتاء

مدرسہ عربیہ مدینۃ العلوم بجنور ۲۳ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ ۲۱ فروری ۱۹۶۹ء

البقرہ

قصہ ابلیس کا

فَسَجَدُوْا	پس سجدہ کر لیا فرشتوں
اِلَّا اِبْلِیْسَ	نے مگر ابلیس نے انکار کر دیا
اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ	اور وہ متکبر بن گیا اور ہو گیا
الْکٰفِرِیْنَ	کافروں میں سے

اس جگہ تشریح میں جناب مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

ان الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس سجدے سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا بلکہ جنوں کی ایک جماعت نافرمانی کے لئے آمادہ ہو گئی تھی اور ابلیس کا نام صرف اس وجہ سے لیا گیا کہ وہ ان کا سردار اور بغاوت میں پیش پیش تھا۔ اور دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا اس صورت میں مطلب ہوگا کہ جنوں کی ایک جماعت پہلے سے ایسی موجود تھی جو سرکش اور نافرمان تھی اور ابلیس کا تعلق اسی جماعت سے تھا[1]

اس تشریح سے دو باتیں سامنے آئی ہیں۔

ا۔ ابلیس کے ساتھ انکار سجدہ کے معاملہ میں جنوں کی ایک جماعت شریک تھی جن کی قیادت ابلیس کر رہا تھا

ب۔ کافر جنوں کی ایک جماعت پہلے سے تھی اور ان میں کا ایک فرد ابلیس بھی تھا اور وہ بھی کافر تھا

مودودی صاحب کا یہ استنباط غالباً کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ

[1] تفہیم القرآن ص ۶۶ ج ۱ فائدہ ۴۷

سے ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس استنباط اور فکر و خیال کی تائید نصوص اور آثار سے ہوتی ہے یا نہیں؟ ظاہر کلام سے مودودی صاحب کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ان کی یہ تشریح ایک غیر معقول تشریح ہے جو اسی مضمون پر مشتمل دوسری آیات کے خلاف ہے کیونکہ كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ کے معنی صَارَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ (یعنی کافر ہو گیا) مراد ہیں یہی حضرت ابن عباس رضؓ نے روایت کیا ہے۔

قرآن پاک میں یہ واقعہ (ابلیس کا سجدہ سے انکار) چند سورتوں میں اور بھی مذکور ہے کہیں اجمال ہے تو کہیں تفصیل ہے کہیں طرز خطاب ایک طرح کا ہے تو دوسری جگہ طرز خطاب دوسری طرح کا ہے نفس واقعہ سب میں یکساں ہے۔

فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِيْنَ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف)	پس سجدہ کیا فرشتوں نے مگر ابلیس نے، نہ ہوا وہ سجدہ کرنے والوں میں سے فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جب میں نے تجھے امر کیا، بولا میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسکو مٹی سے پیدا کیا

ان آیات میں اس شک کا بھی جواب ہے کہ جب ابلیس کو سجدہ کا حکم ہی نہیں ہوا تو اسکو کیوں مکلف قرار دیا؟ اللہ تعالیٰ نے انکو بھی سجدہ کا حکم دیا گیا تھا جس سے اس نے روگردانی کی اور اس روگردانی کی وجہ بھی اس نے خود ہی بیان کر دی کہ اس نے کبر و غرور کی وجہ سے سجدہ نہیں کیا تھا اور ان آیات کے الفاظ سے دو باتیں سامنے آتی ہیں ایک یہ کہ سجدہ سے

انکار کر کے ابلیس سجدہ کرنے والوں (فرشتوں) میں نہ ہوا بلکہ ان سے خارج ہو گیا۔ دوسری بات یہ کہ یہ خطاب صرف ابلیس سے تھا اس جگہ جنات کی کوئی جماعت نہ تھی کہ جن کی لیڈری اور پیشوائی ابلیس کر رہا ہو یا بارگاہ خداوندی میں اپنی جماعت کے ساتھ ایجی ٹیشن کر رہا ہو نفس واقعہ کے وقت اگر ایسا ہوتا تو عبارتِ قرآن اسطرح ہونا چاہیے تھی

مَا منعکم الّا تسجدوا	تمہیں کس چیز نے منع کیا
اذ امرتکم	سجدہ کرنے سے جب میں نے تمکو امر کیا

لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ خطاب (واحد حاضر کے صیغہ سے ہے) صرف ابلیس سے تھا۔ رہی دوسری بات کہ وہ پہلے ہی سے کافروں میں سے تھا یہ بھی قرآن پاک کے الفاظ سے ثابت نہیں ہے سورۂ کہف میں ارشاد ہے:

کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ	وہ جنات میں سے تھا پس وہ
عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف)	نافرمان ہو گیا اپنے رب کے امر کا

آیت میں فاء کا فائدہ یہ ہے کہ امر کی تعمیل نہ کر کے وہ نافرمان ہوا اور اسی نافرمانی کی وجہ سے وہ کافر ہوا شیطان کے لئے کفر اور فسق کا حکم نافرمانی کی وجہ سے دیا گیا، اگر کَانَ کے معنی صرف ہوتے یا تھا کے ہوئے ہوتے تب تو یہ کہا جا سکتا تھا وہ پہلے سے کافر تھا لیکن کَانَ کے معنی اہل لغت کے نزدیک صار کے بھی ہیں جو عام طور سے حالت اور کیفیت کی تبدیلی کے لئے بولا جاتا ہے مثلاً کسی نے کہا کَانَ زیدٌ عالمًا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ زید پہلے عالم نہیں تھا اب عالم ہو گیا تو کَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ کا ترجمہ یہ ہو گا کہ امر الٰہی کی نافرمانی کرنے سے پہلے تو اسکا کفر متحقق اور ثابت نہ تھا (اگرچہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا) لیکن حکم عدولی کر کے وہ کافر اور فاسق ہو گیا اس طرح کَانَ اور فَا دونوں کے معنی بھی

کوئی مجاز نہیں پایا جائیگا اور بات انصاف کی بھی ہے کہ کسی پر کوئی حکم نافذ کرنا ارتکاب فعل کے بعد ہی ہونا چاہیئے نہ کہ ارتکاب فعل سے قبل

اس جگہ ایک اشکال اور باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ آیت پاک میں صراحتہً فرشتوں سے خطاب ہے تو ابلیس کس طرح شامل مانا جائے اور کس طرح اس کو نافرمان تسلیم کیا جائے ؟ یہ بات صرف وہ لوگ تو کہہ سکتے ہیں جو عربیت سے واقف نہ ہوں لیکن جو لوگ عربیت سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ مستثنیٰ کے لیے مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہونا ضروری نہیں ہے ' دوسرا جواب یہ ہے کہ معنی لغوی کے اعتبار سے جن کا اطلاق فرشتوں پر بھی ہوتا ہے سورہ الصافات کی آیات ذیل کو تلاوت فرمائیے

اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ	کیا تیرے رب کے لئے تو بیٹیاں
الْبَنُوْنَ اَمْ خَلَقْنَا	ہوں اور ان کے بیٹے ہوں کیا
الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ	ہم نے فرشتوں کو مؤنث بنایا ہے
شَاهِدُوْنَ	کہ وہ (کافر) بیٹھے مشاہدہ کر رہے تھے

کافروں کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اس آیت کے بعد آگے چل کر ارشاد فرمایا ہے

فَاْتُوْا بِكِتَابِكُمْ اِنْ	اپنی کتاب لے آؤ اگر تم سچے ہو
كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ وَجَعَلُوْا	انہوں نے اللہ اور ملائکہ کے
بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا	درمیان نسب کا رشتہ بنا
(الصافات)	رکھا ہے ۔

اس جگہ جِنَّۃ کا لفظ فرشتوں کے لئے استعمال ہوا ہے مولانا مودودی صاحب نے بھی اس جگہ فرمایا ہے :

اور یہاں مضمون اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں جِنَّۃ کے لفظ کو ملائکہ کے معنی میں لیا جائے ؎[1]

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۰۴ ج ۴ فائدہ ۹۰

چونکہ فرشتے بھی پوشیدہ رہتے ہیں اور جنات بھی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں اسلئے لغوی مشابہت کی وجہ سے ایک لفظ دوسرے معنی میں استعمال ہوجاتا ہے یہی وجہ ابن اسحاق نے بھی بیان کی ہے۔

لاجتنانھم واستتارھم عن اعین الناس — لوگوں کی نظروں سے چھپے رہنے کی وجہ سے فرشتے بھی جنات میں سے ہیں۔

اعشی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی مدح میں کہا ہے

وسخر من الملائکۃ تسعۃ ۔ قیاما لدیہ یعملون بلا اجر

اس جگہ ملائکہ کا لفظ جنات کے لیئے استعمال ہوا ہے[1] حاصل کلام یہ ہے ابلیس فرشتوں کی جماعت میں شامل تھا جب فرشتوں سے خطاب ہوا تو وہ بھی مخاطب تھا اور اس کو بھی سجدہ کا امر دیا گیا تھا (جیسا کہ مذکورہ آیت میں گزر چکا ہے) اس لئے ظاہر عبارت قرآن سے یہ ثابت نہیں ہے کہ پہلے سے جنات کی کوئی جماعت تھی اور ابلیس پہلے ہی سے خلاف تھا یا ابلیس پہلے ہی سے کافر تھا وغیرہ (جیسا کہ مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے)

اس جگہ ہم بھی عرض کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو صرف الفاظ قرآن کو سامنے رکھتے ہوئے ہے جس طرز پر مودودی صاحب نے بات کی ہے اسی طرز پر ہم نے جواب دیا ہے اسلئے نکتہ بازیاں نہ کی جائیں اسی وجہ سے احادیث اور آثار صحابہ رضہ کو ذکر نہیں کیا گیا ہے کیونکہ مودودی صاحب نے کوئی اثر ایسا نہیں دیا ہے بلکہ ظاہر عبارت قرآن کو سامنے رکھتے ہوئے بات کہی ہے اگر مودودی صاحب یہ فرماتے کہ بعض اقوال سے ایسا بھی ثابت ہے تو پھر ہمارے لئے تنقید کی گنجائش نہ تھی۔

یہ نہ کہا جائے کہ وہ قول کہاں سے آگیا۔ ہم کہینگے اسکو مفسرین نے

---

[1] روح المعانی از ۲۳۱ تا ۲۳۳ ج ۱۵

اختیار نہیں کیا ہے کیونکہ وہ قول ظاہر عبارت قرآن کے خلاف ہے اسی وجہ سے اس کو قیل کہہ کر ذکر کیا ہے یعنی مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں ضعیف ترین قول کو اختیار کیا ہے جس کی تائید کسی معتبر اثر صحابی سے نہیں ہوتی اور مودودی صاحب کی عادت اپنی تفسیر میں عام ہے کہ انہوں نے بیشتر جگہ ضعیف اقوال کو ہوا دیکر اپنی قابلیت ثابت کرنا چاہی ہے ہمارے نزدیک یہ چیز تحقیق کے معیار کے مطابق نہیں ہے ہمارے زمانے کے ایک جدید مفسر مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے نہایت خوبی کے ساتھ اس بارے میں دیگر اقوال کو جمع کر دیا ہے ملاحظہ فرمائیے!

یعنی نافرمانی نے اسے کافروں میں داخل کر دیا یہ نہیں کہ وہ پہلے سے کافروں میں تھا ہی۔ یعنی

ای صار من الکافرین باباۂ (عن ابن عباس)	یعنی ہو گیا کافروں میں اپنے انکار کی وجہ سے
ومن اقسام کان الناقصۃ ان تاتی بمعنی صار	اور کان ناقصہ کی قسم یہ بھی ہے کہ وہ صار کے معنی میں بھی آتا ہے

اور بعض اہل تفسیر نے کان کو ہو گیا کے بجائے تھا کے معنی میں لیا ہے انہوں نے فی علم اللہ محذوف مانا ہے ابلیس پر کفر کا اطلاق حکم کے رد اور استکبار پر ہوا محض ترک عمل سجدہ کی بنا پر نہیں ترک عمل کا گناہ کیسا ہی ہو ایمان سے خارج کر دینے اور کفر تک پہونچا دینے کے لئے اہل سنت کے مذہب میں کافی نہیں ہے

(مدارک[1])

ان تشریحات کے بعد ہماری رائے مندرجہ بالا آیات کی تشریح میں

---

[1] تفسیر ماجدی ص۱۰ پ ۱ مطبوعہ پاک

یہ ہے کہ جناب مودودی صاحب کا نقطۂ نظر متوسط اہل علم اردوداں حضرات کے لئے (جنکے لئے انہوں نے یہ تفسیر لکھی ہے) باعث خلجان ہو گا بلکہ باعث اعتراض بھی کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالےٰ پر ظلم اور تعدی کا الزام عائد ہوتا ہے اور ہمارے نقطۂ نظر سے انصاف اور عدل ثابت ہوتا ہے کیونکہ اسکو کافر انکار کی وجہ سے قرار دیا گیا تھا پہلے سے ابلیس کافر تھا یا جو کچھ بھی تھا وہ اللہ تعالےٰ کے علم میں تھا ہمارے علم میں ابلیس کا کفر اس کے انکار کی وجہ سے آیا ہے

قصہ ہاروت اور ماروت کا

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ	اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے
عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا	جو شیاطین سلیمان کی سلطنت
كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ	کا نام لیکر پیش کیا کرتے تھے۔
الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ	حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں
النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ	کیا کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین
عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ	تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم
وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ	دیتے تھے وہ پیچھے پڑے اس
مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَا	چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں
إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ	ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی
	تھی حالانکہ وہ فرشتے جب

بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھ ہم محض ایک آزمائش ہیں تو کفر میں مبتلا نہ ہو

(صہ ۹۸ ج ۱)

ان آیات کی ترجمانی میں مودودی صاحب نے فرشتوں کے

لفظ ہی سے یہ اشارہ دیا ہے کہ تشریح میں کیا ارشاد ہوگا؟ پھر بھی تشریح
میں جو شگوفہ ہے وہ بھی ملاحظہ ہو :۔

اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے
وہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی
اور غلام بنی ہوئی تھی اللہ تعالےٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل
میں ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہوگا جس طرح قوم لوط کے
پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے اسی طرح
ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے
ہونگے وہاں ایک طرف بازار ساحری میں اپنی دوکان لگائی ہوگی
دوسری طرف وہ اتمام حجت کے لئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے
ہونگے دیکھو ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں
تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو مگر اس کے باوجود لوگ ان کے
پیش کردہ عملیات اور نقوش و تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہونگے
فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت
نہ ہو وہ سلطنت الٰہی کے کارپرداز ہیں اپنے فرائض منصبی کے
سلسلہ میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی
ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے
گردوپیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہونگے
رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی تو اس
کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت
خور حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت
کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالت ارتکاب
جرم میں پکڑیں اور اس کے لئے بے گناہی کے

جرم کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں ؎۱

مودودی صاحب نے اس جگہ بھی ترجمانی اور تفہیم خالص مشرقی معاشرت (خاص طور سے ہندوستان اور پاکستان) کے رنگ میں مثال دیکر پیش کی ہے اور قرآن پاک کی آیات میں بیان کئے گئے واقعہ کو کچھ ردوبدل کے ساتھ بیان کیا ہے اسرائیلیات میں ہاروت وماروت (فرشتوں) کو زہرہ اور مشتری کا عاشق بنا کر پیش کیا ہے اور مودودی صاحب نے سی آئی ڈی کا سپاہی، جس طرح وہ اسرائیلی واقعہ من گھڑت ہے اسی طرح یہ تعبیر جھوٹی اور من گھڑت اور بیہودہ تک ہے۔ اس کو انہوں نے دعویٰ کے طور پر کہا ہے۔ جس کی تمام مفسرین نے تردید کی ہے:

"مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے۔"

صورت حال یہ ہے کہ ان آیات میں انتہائی فصاحت وبلاغت کے ساتھ یہودیوں کے اس ذہن کی تردید ہے جو حضرت سلیمانؑ اور سحر کے بارے میں ان کا تھا سحر کی مذمت اور قباحت اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بریت اور دیگر چیزیں اختصار اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کی ہیں

معلوم رہے زمانہ قدیم سے مختلف اقوام عالم میں سحر اور جادوگری کا بہت زور رہا ہے شیاطین اپنے کاہنوں کے ذریعہ بہت سی خرافات شائع کیا کرتے تھے کلدانیوں میں ستاروں کے اثرات اور سحر کا بہت زور تھا اور اسی وجہ سے ان میں کواکب پرستی رائج ہوگئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ساحروں کا بہت زور تھا (جیسا کہ قرآن پاک

؎۱ ہماری رائے یہ ہے کہ اس جگہ ترجمان القرآن اور تھانوی صاحب کی الحکمات ص۱۹۹ کی محض تردید کی خاطر یہ تشریح اختیار کی ہے

؎۲ تفسیر طنطاوی ص۱۰۹ ج

میں بھی ہے ! غرضیکہ یہ سحر اور جادوگری اور عجائب پرستی ہمیشہ رہی ہے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ آیا تو انہوں نے ان خرافات (سحر وغیرہ) کی تمام چیزوں (کتابوں کو اکٹھا کر کے دفن کر دیا اس طرح جادوگری کا زور گھٹ گیا اللہ تعالے نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ معجزہ عطا فرمایا جس میں سحر کی کھلی تردید تھی بلکہ وہ سحر سے بالاتر نبوت اور رسالت کی شان تھی[1] لیکن جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو جنات و شیاطین اور ان کی صفات سے متصف انسانوں کو کھل کر کھیلنے کا موقعہ مل گیا اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی بڑے جادوگر تھے اسی جادو کے زور سے وہ حکومت کیا کرتے تھے اور ہاروت ماروت جو دو فرشتے تھے وہ بھی جادو سکھایا کرتے تھے بس زیادہ سے زیادہ اتنی بات تھی کہ پہلے وہ یہ کہدیا کرتے تھے کہ یہ جادو نہ سیکھو! (اسی کے ساتھ زہرہ اور مشتری کے واقعات اور ان دو فرشتوں کا مسخ ہونا اور ہمیشہ کے لئے عتاب الٰہی میں گرفتار ہو جانا وغیرہ) یہ سب چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہودیوں میں مشہور تھیں قرآن پاک نے نقل حکایت کے طور پر ان آیات میں یہودیوں کے درمیان شائع ذہنیت کی تردید کی ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی برئیت اور ضمناً سحر کی مذمت بیان فرمائی ہے[2] علامہ قرطبی نے مذکورہ آیات کی تاویل اس طرح فرمائی ہے:

> آیت میں ہاروت اور ماروت بدل ہے اور ما (وَمَا اُنْزِلَ) میں نافیہ ہے اور ملکین سے مراد جبرئیل اور میکائیل ہیں کیونکہ یہود کا گمان تھا کہ اللہ تعالے نے ان کو سحر دیکر نازل فرمایا ہے اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے صورت عبارت یوں ہے۔

---

[1] تفسیر طنطاوی ص ج ۱ ص روح المعانی قتقہ ص۳۳۱ تا ۳۳۵ ج ۱

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَمَا	اور سلیمان علیہ نے کفر نہیں کیا
عَلَى الْمَلَكَيْنِ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ	اور نہ فرشتوں پر نازل ہوا۔
هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ كَفَرُوْا	اور لیکن شیاطین ہاروت و
يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ	ماروت نے کفر کیا جو لوگوں کو
بِبَابِلَ لہ	سحر سکھلاتے تھے بابل میں

بات دراصل یہ ہے کہ نحوی اعتبار سے آیت کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں اسطرح پر کہ وَاتَّبَعُوْا کے اوپر عطف ہے مَا اُنْزِلَ کا اور مَا موصولہ ہے درمیان میں وَمَا كَفَرَ سے حضرت سلیمان ؑ کی بریت بیان کی ہے اور "ہاروت و ماروت" کو شیاطین سے بدل البعض قرار دیا گیا اور یہ ملکین کا عطف بیان بھی ہوسکتا ہے اس طرح مَا اُنْزِلَ میں مَا نفی کے لئے ہے ان دو ترکیب کے اعتبار سے قرآن پاک کی آیت کے دو ترجمے یا مطلب ہوئے اور مفسرین نے دونوں کو بیان کیا ہے اور ہر ایک مطلب بیان کرنے کے بعد بعض احتمال بھی بیان کئے ہیں مثلاً فرشتے کفر اور معصیت کی تعلیم نہیں دے سکتے تھے فرشتے انسان کی صورت میں آنے کے بعد بھی اپنے ملکوتی صفات پر قائم رہتے ہیں مثلاً قرآن پاک میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں کے سامنے کھانا پیش کیا تو انہوں نے اس سے اعراض کیا اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوف معلوم ہوا"

اس سے ثابت ہے کہ فرشتے انسانی شکل میں آنے کے بعد انسانی ضروریات سے متصف نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی ملکوتی صفات پر قائم رہتے ہیں اور فرشتوں کی ملکوتی صفت یہ بھی ہے کہ وہ معصیت اور کفر کا ارتکاب نہیں کرتے اس لئے مذکورہ بالا آیت میں فرشتوں کے لئے کفر کا ارتکاب لازم آتا ہے لہٰ اسلئے یہ نہیں ہوسکتا کہ ملکین سے مراد حقیقۃً فرشتہ ہوں۔ یا پھر یہ کہا جائیگا

لہ جواہر القرآن الطنطاوی صفحہ ج ۱

کہ آیت میں ما نفی کا آنے کی وجہ سے فرشتوں سے سحر سکھانے کی نفی ہے اس طرح یہودیوں کے ذہن اور پروپیگنڈہ کی نفی کرنا مقصود ہے۔

علامہ جوہری طنطاوی نے اسی تاویل کو اختیار کرتے ہوئے اس کی تائید میں ایک اشارہ بھی دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ آیت کے آخر میں موجود ہے[1]

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ	اور لوگ سیکھ لیتے تھے ان
مَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ	لوگوں سے کہ جن کے لئے آخرت
خَلَاقٍ	میں کوئی حصہ نہیں ہے

یعنی سحر کو فرشتوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے سیکھا جاتا تھا کہ جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ فرشتے نہیں ہو سکتے یہ آیت اتنا بڑا قرینہ ہے کہ جس کی بنا پر ہاروت اور ماروت کو فرشتہ قرار نہیں دیا جا سکتا اسی کو علامہ قرطبی نے اختیار کیا ہے

ہم اس جگہ پھر وہی بات کہیں گے کہ مودودی صاحب نے ان آیات کی تفسیر میں قول مرجوح اور ضعیف کو اختیار کیا ہے جو نص قرآنی کے سراسر خلاف ہے اور ایک قول مردود ہے۔

ہم نے ایسا محسوس کیا ہے کہ اس جگہ مودودی صاحب نے محض اپنے بعض معاصرین (مولانا آزاد اور علامہ عبداللہ عمادی) کے رد میں ایسا کیا ہے ان ہر دو حضرات نے چونکہ ہاروت اور ماروت کے فرشتہ ہونے کا انکار کیا ہے اس لئے مودودی صاحب کے لئے لازم ہو گیا کہ وہ ان کے حزب مخالف میں کھڑے ہوں چاہے کتنا ہی غلط طریقہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے اسی وجہ سے انہوں نے ان آیات کی تفسیر میں ایسی بھونڈی تعبیر اختیار کی ہے گویا اللہ تعالےٰ نے بھی ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی طرح اپنے دو فرشتے بطور سی آئی ڈی کے مقرر فرمائے کہ پہلے وہ جادو سکھائیں

---

[1] جواہر القرآن صفحہ ج ۱

اور پھر گرفتار کرلیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ

ے جب مسیحا دشمنِ جاں ہو تو کب ہے زندگی
کون رہبر ہو سکے جب خضر بہکانے لگے

یہ مودودی صاحب کی عربیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے وہ عطف بیان اور بدل کا مطلب ہی نہیں سمجھے انہوں نے ما نافیہ اور ما موصولہ میں فرق ہی نہیں کیا۔ ان سے پوچھا جائے حضرت! اسرائیلیوں کے زہرہ مشتری والے فسانہ اور آپ کے سی آئی ڈی والے ناول میں کیا فرق ہے یہ تاویل ہم نے تفسیر روح المعانی، تفسیر مظہری، تفسیر جواہر القرآن سے خلاصہ کے طور پر اخذ کی ہے۔

نیکی اور ایمان

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (الیٰ قولہ) وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ	نیکی یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر (الیٰ قولہ) یہی لوگ متقی ہیں (ص۱۳۷)

اس کی تشریح فائدہ ۱۷۵ کے تحت اس طرح بیان کرتے ہیں

مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے کو تو محض بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے دراصل مقصود یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ مذہب کی چند ظاہری رسموں کو ادا کر دینا اور صرف ضابطہ کی خانہ پری کے طور پر چند مقررہ مذہبی اعمال انجام دینا اور تقویٰ کی چند معروف شکلوں کا مظاہرہ کر دینا حقیقی نیکی نہیں ہے جو اللہ کے ہاں وزن اور قدر رکھتی ہو۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن ص۱۳۷ ج ۱ فائدہ ۱۷۵

اس فائدہ سے پہلے بطور ربط کچھ نہیں کہ جس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ اس فائدہ کا تعلق فلاں عبارت سے ہے حالانکہ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں بہت جگہ عام مفسرین سے ہٹ کر بات کہی ہے اور زور دیا ہے کہ مفسرین کا یہ فرمانا سیاق و سباق کلام یا ظاہر عبارت قرآن کے خلاف ہے یا ان کی تفاسیر ظاہر قرآن کے مطابق نہیں ہیں وغیرہ ذلک

اس جگہ مودودی صاحب کے ترجمہ اور تشریح کو اگر سامنے رکھا جائے تو ناظرین خود فیصلہ کرینگے کہ مجموعی طور سے نتیجتاً قلب کے اوپر کیا اثر پڑتا ہے یہی تو کہ مذہبی اعمال اور مراسم اور تقوی کی ظاہری شکلیں بیکار محض ہیں یہ خیال آنے کے بعد آدمی میں جیسی دینداری آئے گی وہ ظاہر ہے اس کے علاوہ مودودی صاحب کی تشریح سیاق و سباق کلام سے بالکل ہٹ کر ہے

بات دراصل یہ ہے کہ "سیقول السفہاء" سے تحویل قبلہ کا مضمون چل رہا ہے درمیان میں چند دیگر امور کو بیان فرما کر بات پھر تحویل قبلہ کے متعلق شروع کر دی ہے[1] اور اہل کتاب کی ذہنیت اور مذہبیت کی تردید فرمائی ہے کہ وہ پہلے دین کی کسی چیز کے پاس نہ تھے بلکہ اپنے دین کو بدل دیا تھا اب جبکہ تحویل قبلہ کا حکم ہوا تو اپنے اس مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت اس طرح دی کہ گویا ان کا کل دین بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے سے وابستہ ہے اللہ تعالے نے ان کی اس ذہنیت اور مذہبیت کی تردید ان آیات میں فرمائی ہے اور بتلایا ہے کہ نیکی صرف وہی نہیں ہے جو انہوں نے اب قرار دے رکھی ہے بلکہ یہ ہے الخ

تمام مفسرین اور اہل ترجمہ نے اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ

---

[1] مناسبت مضمون اور ربط آیات کو اگر بیان کیا جائے تو پھر اس کے متعلق ایک جداگانہ کتاب تصنیف کی ضرورت ہے ربط آیات کے لئے ملاحظہ فرمائیں تفسیر روح المعانی

کیا ہے بعض نے اپنے ترجمہ میں پس منظر کی رعایت رکھی ہے اور بعض نے فوائد میں اس کو واضح کر دیا ہے مودودی صاحب اس پس منظر سے واقف ضرور تھے لیکن ظاہر عبارت قرآن کے سمجھنے میں ان سے یقیناً خطا ہوئی ہے۔
کیونکہ آیت پاک میں کھلا ہوا قرینہ ہے کہ اس جگہ یہود و نصاری مراد ہیں اس میں مسلمانوں سے خطاب نہیں کیونکہ آیت کے شروع حصہ میں نماز کا ذکر نہیں ہے اور بعد والے جزو میں نماز وغیرہ کا ذکر آ رہا ہے یہ وہ قرینہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن مودودی صاحب نے اپنی تشریح میں اس طرح بات کہی ہے اور اس طرح مراسم دینیہ کی تردید کی ہے کہ جس سے مراسم دینیہ کی وقعت کم ہو جائے اور ایک موڈرن اسلام وجود میں آجائے۔

اس کے علاوہ ان سے ترجمانی میں بھی سہو ہوا ہے وہ قرآن پاک کی اس عبارت کو سمجھ ہی نہیں پائے، غور فرمائیے! آیت میں پہلا "البر" میں الف لام جنس کا ہے اور نفی عموم جنس کی ہے جنس کی تعریف یہ ہے کہ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں تو اس جگہ جنس کامل یا کمال جنس یعنی کمال نیکی کی نفی ہے اور "لکن" جو استدراک کے لئے اس نے واضح کر دیا ہے کہ آیت میں کمال کی نفی مراد ہے۔ اس کے بعد دوسرا "البر" الف لام عہد خارجی کیلئے بھی ہے اور جنس کے لئے بھی اس طرح الکن سے قصر ادعائی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور چونکہ اس کے بعد من موصولہ ہے اس لئے اس جگہ اضافت کا ترجمہ ہوگا اور "البر" جو مصدر ہے اس کے معنی فاعل کے ہونگے یعنی بر من آمن یا البار من آمن اس طرح ترجمہ یہ ہوگا۔

نہیں ہے کمال نیکی صرف منہ کر لینا مشرق کو یا مغرب کو لیکن

کمال نیکی (دوسرا ترجمہ) کمال نیکو کار وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخر پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دیتے ہیں مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں اور مسافروں کو الخ

اس طرح دوسرے جزو میں مسلمانوں کی تعریف ہے اور ان کے مذہبی مراسم اور ان کے تقوے کی تمام شکلوں کی تعریف ہے اور آخر میں نہایت تاکید کے ساتھ ان مراسم ادا کرنے والوں (مسلمانوں) ہی کو متقی قرار دیا ہے اب ناظرین کرام مودودی صاحب کی آزاد ترجمانی اور ہمارے معیار ترجمہ کا فرق ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ وہ کون سے قرآن اور کون سے اسلام کی تفہیم اور تعارف کراتے ہیں ! ؟

دیگر تراجم و تفاسیر

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح نے ترجمہ تو یہی کیا ہے جو ہم نے کیا ہے تشریح میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

خاص سمتوں کا قصہ یہاں اس وجہ سے مذکور ہوا ہے کہ تحویل قبلہ کے وقت تمامتر بحث یہود و نصاریٰ کی اسی میں رہ گئی تھی اسلئے متنبہ فرمایا ہے کہ اس سے بڑھ کر کام اور ہیں ان کا اہتمام کرو۔ (بیان القرآن)

حضرت شیخ الہند رح نے بھی اسی مفہوم پر مشتمل ترجمہ کیا ہے وہ اپنی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں :-

اور یہود و نصاریٰ چونکہ ان عقائد اور اعمال و اخلاق میں قاصر اور ناقص تھے اور طرح طرح سے ان میں خلل اندازی کرتے تھے جیسا کہ آیت قرآنی میں اس کا ذکر ہے تو اب یہود اور نصاریٰ کا اپنے استقبال قبلہ پر ناز کرنا اور اپنے آپ کو طریق ہدایت پر

مستقیم سمجھنا اور مستحق مغفرت کہنا بیہودہ خیال ہے تاوقتیکہ ان
عقائد اور اعمال و اخلاق پر قائم نہ ہوں جو اس آیت کریمہ میں
بالتفصیل مذکور ہیں صرف استقبال قبلہ سے ہدایت نصیب نہیں
ہو سکتی ہے اور نہ عذاب ہی سے نجات مل سکتی ہے (ص۱۳۶)
یعنی کلام پاک میں روئے سخن یہود و نصاریٰ کی طرف ہے اور ان کے
طریقہ اور مذہب کی تردید کرتے ہوئے ان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ
اپنے آپ کو ان ہی چیزوں کا مکلف بنائیں جن چیزوں کے مسلمان مکلف
ہیں اور مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اللہ پر آخرت کے دن پر، تمام
کتابوں، رسولوں، فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں
اور زکوٰۃ دیتے الخ۔ یہ ہے نیکی اور کمال تقویٰ اس پس منظر کو سامنے
رکھنے کے بعد مودودی صاحب کی تشریح کو پڑھا جائے تو بات بالکل
بدلی ہوئی معلوم ہوگی اور اسی کوتاہی پر ہماری تنقید ہے

سحری کا وقت

كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا	نیز راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی
حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ	دھاری سے سپیدۂ صبح
الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ	کی دھاری نمایاں طور پر نظر
الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ	آجائے (ص۱۴۹)

وقت سحر کے بارے میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بیان
کیا ہے:-

آج کل لوگ سحری اور افطار دونوں کے معاملہ میں شدت
احتیاط کی بنا پر کچھ بے جا تشدد برتنے لگے ہیں مگر شریعت
نے ان دونوں اوقات کی ایسی حد بندی نہیں کی کہ چند سکنڈ
یا چند منٹ ادھر ادھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو

سحر میں سیاہی شب سے سپیدۂ سحر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طلوع فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی ہو تو جلدی سے اٹھ کر کچھ کھا پی لے۔

یہاں تک مودودی صاحب نے جو کچھ بیان کیا ہے اگرچہ اس پر بھی تنقید ہو سکتی ہے لیکن اگر ان کی اس تشریح سے سرسری طور پر گذرا جائے تو اس کی گنجائش ہے لیکن اس کے بعد انہوں نے ایک حدیث کا سہارا لیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضور نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آجائے تو فوراً نہ چھوڑ دے بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے[1]

اس سے ہندوستان اور پاکستان اور دیگر بلادِ اسلام (عرب کے علاوہ) کے رہنے والے یہی سمجھیں گے کہ اذان فجر کے بعد سحری کھانے کی گنجائش ہے۔ حالانکہ صدیاں گذرنے کے باوجود بھی مسلمان اس کے خلاف ہی جانتے ہیں اور اسی پر ان کا عمل ہے کہ وقت سحری اذان فجر سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے اور اذان فجر سے تو اچھا خاصا دن نکل آتا ہے پھر یہ اجتہاد کیسا اور کہاں سے؟ جبکہ احادیث کا مطلب ان کے خلاف ہے حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ مودودی صاحب سے فہم حدیث میں کوتاہی ہوئی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں (اور غالباً آج بھی عرب میں) تہجد کی بھی اذان کا طریقہ تھا اور پھر جب صبح صادق ہو جاتی تو پھر دوبارہ اذانِ فجر دی جاتی تھی مودودی صاحب نے جس اذان کا ذکر کیا ہے اس سے اذان تہجد مراد ہے نہ کہ اذانِ فجر۔ انہوں نے

---

[1] صفحہ ۱۴۸۔ فائدہ ۱۹۲

یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ اس اذان سے اذان فجر مراد نہ لینا چاہیئے ہماری اس تشریح کی تائید چند احادیث سے ہوتی ہے

عن عائشة رضا ن	حضرت عائشہ رض نے روایت
رسول اللہ صلے اللہ علیہ	کیا ہے کہ حضور م نے فرمایا تمہیں
وسلم قال لا یمنعکم اذان	بلال کی اذان سحری کھانے کر
بلال عن سحورکم فانہ	نہ روک دے وہ رات میں ہی اذان
ینادی بلیل فکلوا واشربوا	دیدیتے ہیں پس کھاؤ پیو یہاں
حتی تسمع اذان ابن ام	تک کہ ابن ام مکتوم کی اذان
مکتوم فانہ لا یوذن حتی	نہ سن لو وہ جب تک فجر نہ ہوجائے
یطلع الفجر	اذان نہیں دیتے ۔

اس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اذان سے مراد اذان فجر نہیں ہے ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں ۔

لا یغرنکم نداء بلال	تمہیں بلال کی اذان سے دھوکہ
وھذا البیاض حتی ینفجر	نہ ہو اور اس سپیدی سے بھی
الفجر ۔	تاوقتیکہ فجر ظاہر نہ ہوجائے ۔

اور حضرت ابن مسعود رض کی روایت میں مذکورہ الفاظ کے بعد صراحت ہے

فان بلالا یوذن بلیل	بلال رات ہی میں اذان دیدیتے
اوقال ینادی بلیل او	ہیں یا فرمایا رات ہی میں
قال ینادی لینبتہ نائمکم	نداء دیدیتے ہیں یا فرمایا
ولیرجع قائمکم	وہ نداء دیدیتے ہیں تاکہ تمہارے

سونے والے بیدار ہوجائیں اور اور صلوۃ تہجد پڑھنے

والے گھروں کو واپس ہو جائیں۔

راوی نے تشریح کر دی ہے کہ حضرت بلال کی اذان تہجد کے لئے تھی اسلیئے مودودی صاحب کا اذان سے اذان فجر مراد لینا ایک کھلا ہوا ایسا سہو ہے جس سے لوگ بڑی سنگین غلطی میں مبتلا ہونگے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ سحر میں تاخیر مستحب ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ صبح کی اذان تک کھانے کی اجازت ہو یہ مودودی صاحب کی اپنی ذاتی رائے ہے اور رائے بھی ایسی کہ خود اس پر نہ وہ عمل کرتے ہونگے اور نہ ان کے پیرو کار بخاری و مسلم میں ایک روایت اور ہے جس کو حضرت انس رضؓ نے روایت کیا ہے

قال تسحرنا مع رسول	ہم حضورؐ کے ساتھ سحری کھایا
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	کرتے تھے پھر نماز کیلئے کھڑے
ثم قمنا الی الصلوٰۃ قال	ہو جاتے تھے حضرت انس رضؓ نے
انس قلت لزید کم کان	کہا کہ میں نے حضرت زید رضؓ سے
بین الاذان والسحور	کہا اذان اور سحری کے درمیان
قال قدر خمسین آیۃ	کتنا فاصلہ تھا فرمایا بقدر پچاس

آیتوں کے۔

یعنی جتنی دیر میں پچاس آیت پڑھی جاتی ہیں اب اندازہ خود ہی کر لیجئے کہ سحری میں اذان فجر یا صلوٰۃ فجر میں اگر پچاس آیت تلاوت کرنے کے بقدر فاصلہ تھا تو کتنی دیر کا فاصلہ تھا اور آج کل کیا اس کے خلاف ہوتا ہے عام طور پر سحر سے پانچ منٹ قبل کھانا ختم کر دیتے ہیں اور سحر کی کوئی مقررہ علامت (گولہ وغیرہ) کے پانچ منٹ بعد اذان ہو جاتی ہے اور غالباً اتنا وقت پچاس آیت کی تلاوت پر لگ سکتا ہے مودودی صاحب کو یہ بھی پسند نہیں ہے بلکہ ان کا حکم دوسرا ہے کہ اذان فجر کے

بعد اگر موقع لگے تو کچھ کھا پی لینا چاہیئے۔ اگر ان کا عمل بعینہ اپنی رائے پر ہے (یقین ہے کہ نہ ہوگا) تو اجماعًا ان کے روزے نہ ہونگے[1] پوری امت کا روز اول سے آج تک اسی پر اجماع ہے

صلوٰۃ الوسطیٰ

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ	اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو! خصوصًا ایسی نماز جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو اور اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہو جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ (ص۱۸۲ ج۱)

مودودی صاحب نے صلوٰۃ الوسطیٰ کے لئے جو ترجمانی اختیار کی ہے "خصوصًا ایسی نماز جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو" اس پر قدرے تامل سے گذرنے والا ناظر سوچ سکتا ہے کہ مقررہ نمازوں میں کوئی ایسی بھی نماز ہو سکتی ہے جو محاسن صلوٰۃ کو جامع نہ ہو اور کوئی ایسی نماز بھی ہے جو محاسن صلوٰۃ کو جامع ہو یہ تقسیم مقررہ نمازوں میں سے کسی ایک کے لئے عجیب سی ہے مزید تشریح کے لئے فائدہ ۲۶۳ میں تحریر فرماتے ہیں

> اصل میں لفظ الصلوٰۃ الوسطیٰ ہوا ہے اس سے مراد بعض مفسرین نے صبح کی نماز لی ہے اور بعض نے ظہر کی، بعض نے مغرب کی اور بعض نے عشاء کی۔ لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں صرف اہل تاویل کا استنباط ہے سب سے زیادہ اقوال نماز عصر کے حق میں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہے لیکن جس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جنگ

---

[1] یہ پوری تفصیل ابن کثیر ص۲۱۳ ج۱ مظہری ص۲۰۰ ج۱ روح المعانی ص۲۶ ج۲ سے ماخوذ ہے

احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے حملے نے اس درجہ مشغول رکھا کہ سورج ڈوبنے کو آگیا اور آپ نماز عصر نہ پڑھ سکے[1] اس وقت آپ نے فرمایا کہ خدا ان لوگوں کی قبریں اور ان کے گھر آگ سے بھردے انہوں نے ہماری صلوۃ وسطےٰ فوت کرادی " اس سے یہ سمجھا گیا کہ آپ نے عصر کو صلوۃ وسطیٰ فرمایا ہے حالانکہ اس کا یہ مطلب ہمارے نزدیک زیادہ قرین صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلےٰ درجہ کی نماز ہم سے فوت کرادی ناوقت پڑھنی پڑے گی، جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی خشوع و خضوع اور اطمینان و سکون کے ساتھ نہ پڑھ سکیں گے۔

وسطیٰ کے معنی بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی ہیں جو اعلےٰ اور اشرف ہو صلوۃ وسطےٰ سے مراد بیچ کی نماز بھی ہو سکتی ہے اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کے ساتھ پڑھی جائے اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں، بعد کا فقرہ کہ اللہ کے آگے فرماں بردار بندوں کی طرح کھڑے ہو خود اس کی تفسیر کر رہا ہے ص۱۸۳ ج ۱

عبارت کا تجزیہ

مودودی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت کا تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے :-

---

[1] نقل واقعہ میں بھی مودودی صاحب سے سہو ہوا ہے غزوۂ احزاب میں حضور کی دو نمازیں ظہر اور عصر کی فوت ہوئی تھیں اور یہی صحیح روایت ہے روح المعانی ص۵۶ ج ۱

نوٹ :- صلوۃ وسطیٰ کے جو معنی مودودی صاحب نے بیان کئے ہیں یہ معنی بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ مولانا آزاد نے بھی بیان کئے تھے مولانا آزاد کی کتاب حقیقۃ الصلوۃ ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی تھی جو الہلال کے تین مقالوں کا مجموعہ ہے ملاحظہ فرمائیں مذکورہ کتاب ص۲۶

۱۔ لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے صرف اہل تاویل کا استنباط ہے یعنی صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں جتنے اقوال بھی ہیں وہ اجتہادی ہیں تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ قریبًا ۳۹ یا چالیس اقوال حضرات صحابہ رضؓ اور تابعین کے اس بارے میں ہیں ان اقوال میں اوقات پنجگانہ میں سے کسی ایک کو صلوٰۃ وسطےٰ قرار دیا ہے لیکن یہ کیا صرف قیاس ہی ہے کہ اس کی بنیاد کسی اثر صحابی اور حدیث رسول پر قائم نہ ہو اگر ایسا ہے تو ان کے بعد مودودی صاحب کا بھی یہ ایک قیاس ہے جس کی بنیاد صرف ان کی فہم ہے نہ لغت سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ کسی حدیث اور اثر صحابی سے اور نہ کسی قول تابعی سے اور اقوال تابعین کا مبنیٰ تو اثر صحابی اور احادیث رسول ہی ہیں اس لیئے ان کے اقوال اقرب الی الصواب ہیں کیونکہ فضیلت اور فوقیت دین کے معاملہ میں ان ہی حضرات کے اقوال کو ہے نہ کہ تیرہ سو سال کے بعد ہم جیسے لوگوں کی بے بنیاد رایئوں کو۔

۲۔ دوسری بات صلوٰۃ وسطیٰ کی تشریح میں فرماتے ہیں :

> حالانکہ اس کا یہ مطلب ہمارے نزدیک زیادہ قرین صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلیٰ درجہ کی نماز ہم سے فوت کرا دی نا وقت پڑھنی پڑے گی جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی خشوع و خضوع اور اطمینان سے نہ پڑھ سکیں گے۔

حدیث شریف "صلوٰۃ وسطیٰ" کا یہ مطلب لینا بھی غلط ہے کیونکہ غزوۂ احزاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو نماز ظہر اور عصر (ایک روایت کی بناء پر) یا تین نمازیں بشمول مغرب (دوسری روایت کی بناء پر) قضا ہوگئیں جنکو آپ نے عشاء کے وقت میں جماعت کے ساتھ ادا فرمایا اور اپنے صحابہ رضؓ سے خطاب فرمایا کہ:۔

صلّوا کما رأیتمونی اُصلی — ایسے ہی نماز پڑھو جیسا کہ تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

ان نمازوں میں صرف یہ تو تھا کہ وہ خلاف وقت ادا کی گئیں تھیں لیکن تھیں کامل اور خشوع اور خضوع کے ساتھ اگر وہ جلدی جلدی یا بلاخشوع وخضوع کے تھیں تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو اسی کی تعلیم دی تھی؟ ہرگز نہیں! یہ مطلب جو مودودی صاحب نے بیان کر دیا ہے وہ ان کی ایجاد ہے اور ایک غلط بات جو اُن کے قلم سے نکل گئی ہے محض سخن پروری کے طور پر صرف اسکو نباہنے کے لئے ہے اسکے بعد اب ہم الصلوٰۃ الوسطیٰ کی تحقیق بیان کرتے ہیں۔

صلوٰۃ کی تحقیق

مذکورہ تشریح میں مودودی صاحب نے یہ تاثر دیا ہے

ا۔ صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے جس سے یہ کہا جا سکے کہ صلوٰۃ وسطےٰ فلاں وقت کی نماز کا نام ہے

ب۔ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد وہ نماز ہے جو محاسن صلوٰۃ کو جامع ہو اور اس کے لئے ان کے پاس یہ قرینہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ

اس تشریح سے خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ کا تعلق پانچوں نمازوں سے ہے یا صرف صلوٰۃ وسطےٰ سے تعلق ہے اگر صلوٰۃ وسطیٰ سے تعلق تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس جملہ کو صلوٰۃ وسطیٰ کا بدل قرار دینا ہوگا حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ الخ بھی جملہ فعلیہ انشائیہ ہے اور قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ بھی جملہ فعلیہ انشائیہ ہے اور جس میں قَانِتِينَ حال واقع ہو رہا ہے اور حال اسی جمع غائب کی

ضمیر سے ہے جو قُوْمُوْا میں ہے اور وہی ضمیر حَافِظُوْا میں ہے اس طرح مطلب یہ ہوگا

پانچوں نمازوں کی حفاظت کرو اور صلوٰۃ وسطیٰ کی خاص طور سے حفاظت کرو اور سب نمازوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع اور خضوع کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ

اس طرح پوری عبارت اس طرح پر ہوگی حافظوا علی الصلوٰۃ وحافظوا علی الصلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للہ قانتین دوسری جگہ کے حافظوا کو فصاحت و بلاغت کلام کیوجہ سے حذف کردیا ہے کیونکہ ایک فعل کے تحت متعدد مفعول لے آنا فصاحت و بلاغت کے عین مطابق ہے، بیچ میں سے یہ نکتہ پیدا کرنا غلط ہے کہ حافظوا علی الصلوٰت میں جب پانچ نمازیں آگئیں تو الصلوٰۃ الوسطیٰ کونسی نماز ہے؟۔ نصوص سے جب فرض نمازوں کو پانچ وقتوں کے ساتھ مقید کردیا تو صلوٰۃ وسطیٰ خود اس میں مقید ہے ہاں اگر اوقات صلوٰۃ پانچ نہ ہوئے ہوتے تو صلوٰۃ وسطیٰ چھٹی نماز بن سکتی تھی

معلوم رہنا چاہیئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کی تین قسطوں میں حقیقتِ صلوٰۃ کے بارے میں ایک مقالہ لکھا تھا یہ مضمون ۱۹۲۰ء میں "حقیقت الصلوٰۃ" کے نام سے مستقل ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں مولانا نے بہت تفصیل سے بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے:۔

وہ نماز جو ان اوصاف کی جامع ہو شریعت کی اصطلاح میں وہی نماز وسطیٰ ہے الخ[1]

ہم نہیں کہتے کہ مودودی صاحب نے اپنی تشریح میں مولانا آزاد سے

---

[1] حقیقۃ الصلوٰۃ ص۵۲ ج۱ ترجمان القرآن ص۲۸۹ ج۱

الکتاب فیض کیا ہے یا یہ خود ان کا اپنا قیاس ہے

صحیح بات یہ ہے کہ قرآن پاک کا صحیح مطلب، تفسیر، ترجمہ اولاً تو وہ ہے جو اس ذات گرامی نے بیان کیا ہو جس (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) پر قرآن پاک نازل ہوا ہے ثانیاً وہ جن کے سامنے قرآن نازل ہوا وہ اس موقع و محل تمام چیزوں اور حالات سے واقف تھے اس جگہ زیادہ طویل بات تو ہم نہیں کہتے مختصراً عرض کرتے ہیں

۱۔ صلوٰۃ وسطیٰ عصر کی نماز کا ہونا غزوۂ احزاب والے واقعہ سے ثابت ہے۔

۲۔ امام احمد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ زید بن ثابت رض نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز دوپہر کو پڑھا کرتے تھے اور آپ کے پیچھے ایک اور دو صف ہوتی اور لوگ قیلولہ کرتے ہوئے ہوتے یا اپنی تجارت میں مشغول ہوتے اس وقت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا حافظوا الخ

۳۔ امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ ابی یونس مولی حضرت عائشہ رض نے کہا ہے حضرت عائشہ رض نے مجھے حکم دیا کہ میں ان کے لئے مصحف کی کتابت کروں مجھے حضرت عائشہ رض نے لکھوایا

حافظوا علی الصلوٰات والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلاۃ العصر

اور فرمایا میں نے اسکو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، اس قرأت کے اعتبار سے الصلوٰۃ الوسطیٰ سے صلوٰۃ عصر وحی سے ثابت ہے یہ بات دیگر ہے کہ یہ قرأۃ شاذہ ہے پھر بھی حضرت عائشہ رض کے نزدیک ہے قرآن پاک اس سے زیادہ قوی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے علاوہ ازیں خود حضرت عائشہ رض نے فرمادیا کہ اس کو میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس لیے مودودی صاحب

کا وہ دعویٰ بھی غلط ہوا کہ یہ صرف اہل تاویل کا استنباط ہے

۴۔ بالکل ایسی ہی ایک روایت حضرت حفصہؓ کے بارے میں ہے [1]

یعنی قرآن پاک کی ایک قرأت میں الصلوٰۃ الوسطیٰ کے بعد الصلوٰۃ العصر بھی ہے غرض یہ ہے کہ ظہر اور عصر کے علاوہ اگر دیگر اوقات کے بارے میں روایات کو نہ بھی قبول کیا جائے تو ظہر اور عصر کے بارے میں روایات ناقابل تردید ہیں جب صلوٰۃ وسطیٰ کے نام یا اس تفسیر کے بارے میں نص موجود ہے تو اس کے وہ معنی بیان کرنا جو صرف اپنی عقل ناقص کی گھڑنت ہو بلاشبہ یہ تفسیر بالرائے ہے۔

نمرود کی سیاسی ربوبیت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ الخ	کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا ص ۱۹۷ ج ۱

مودودی صاحب نے اقسام شرک اور ربوبیت پر فائدہ ۲۹۱ میں تفصیلی کلام کرتے ہوئے نمرود کے دعویٰ اُلوہیت اور ربوبیت کے بارے میں تحریر کیا ہے

نمرود کا دعوئے خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا وہ اللہ تعالےٰ کے وجود کا منکر نہ تھا اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبر وہ خود ہے

لیکن جب نمرود نے یہ اعلان کر دیا کہ میں مارتا بھی ہوں اور جلاتا بھی ہوں تو وہ اپنے گمان باطل میں کیا خیال باندھے ہوئے تھا؟ یہی نا کہ وہ مختار کل ہے اور موت و حیات بھی اس کے قبضہ میں ہے جب یہ خیال تھا تو منکر خدا ہونے کیلئے مزید کس دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے۔؟

[1] تفسیر روح المعانی ص ۱۵۶ ج ۲

اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسباب عالم کے پورے سلسلہ پر اس کی حکومت چل رہی ہے بلکہ اسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اس ملک عراق اور اس کے باشندوں کا حاکم مطلق میں ہوں میری زبان قانون ہے میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں اور عراق کا ہر وہ باشندہ غدار ہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے یا میرے سوا کسی اور کو اپنا رب تسلیم کرے۔

لیکن اگر کسی ملک کا حاکم یہ اعلان کردے میری زبان سے جو نکلتا ہے وہ قانون ہے (جیسا کہ شہنشاہیت میں ہوتا تھا)

ب۔ میرا اقتدار اس ملک پر پورا ہے۔ میرے اوپر کوئی دوسرا حکم کرنے والا نہیں ہے میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں (جیسا کہ ڈکٹیٹر شپ میں ہوتا ہے)

تو کیا ایسا ڈکٹیٹر شرعًا کافر ہے؟ کیا زمانہ شہنشاہیت کے ایسے مسلمان حکمران کافر تھے؟ شرعی طور پر یہ تو اسباب کفر میں سے نہیں ہیں۔ تو کیا منطقی طور پر یہی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ نمرود کافر نہیں تھا۔ باوجودیکہ وہ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ بھی کہتا تھا

اور رہا رب ماننا۔ یہ لفظ بھی مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہے رب المال، رب الغلام، رب الاولاد (باپ) وغیرہ

ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبود اور رب مانتا ہوں اور اس کے سوا سب کی خدائی اور ربوبیت کا قطعی طور پر منکر ہوں تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابل برداشت ہے بلکہ سوال یہ بھی اٹھ

کھڑا ہوا کہ قومی سیاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس
عقیدے کی جو زد پڑتی ہے اسے کیونکر نظرانداز کیا جا سکتا ہے
یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم جرم بغاوت کے الزام میں نمرود
کے سامنے پیش کیے گئے۔ ص ۱۹۹ فائدہ ۲۹۱ لہ

لہ ان سطور میں جہاں مودودی صاحب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اقدامات (بت شکنی وغیرہ) کو ایک قسم کی سیاسی بغاوت قرار دیا ہے وہاں نمرود کی جوابی کارروائیوں کو سیاسی انتقام قرار دیا ہے اس عبارت کے پس منظر سے مودودی صاحب کے جو عزائم ملکی سیاست اور اقتدار اعلیٰ کے بارے میں جھانک رہے ہیں وہ تمام چیزیں پاکستانی سیاست کی تاریخ نے ان کے بارے میں ثابت کر دیں ہیں۔ صدر ایوب کے بارے میں ان کے کیا خیالات تھے اور مودودی صاحب کسطرح ان کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتے تھے ان کی گرفتاری اور ان کی طویل قید اور ان کا اپنی مفروضہ حکومتِ الٰہیہ کے لئے فاطمہ جناح کو صدارت کے الیکشن میں سپوٹ (وہ بھی عجیب حکومتِ الٰہیہ ہوتی کہ جس کا سربراہ عورت ہوتی) اور پھر بھٹو کے زمانہ میں غیر مسلم ممالک کی اسی لاکھ روپیہ کی امداد اور ملک میں طویل ایجیٹیشن، بنگلہ دیش میں ان کے حامیوں کا بنگالیوں کا قتلِ عام کرنا یہ سب چیزیں اخبارات میں ریکارڈ ہیں ملاحظہ فرمائیں) عوام دہلی ۵ رجون ۱۹۷۸ء، الجمعیۃ ۱۹ رجون ۱۹۷۸ء۔

مودودی صاحب نے اپنے تخیلات اور مفروضوں کی بھیڑ ہانکنے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے قصہ کو ایک سیاسی جرم قرار دیدیا لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ جب یہ بات ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین مکہ، یہود مدینہ کے تمام اقدامات ان کے نزدیک سیاسی تھے کیونکہ وہاں زیادہ قرآن ہیں جب وہ مقام آئے گا تو ان کی تحریر اور ہمارا جواب ناظرین کے سامنے ہوگا کہ حق کدھر ہے؟ اس کا فیصلہ ناظرین خود کریں گے۔

مذکورہ اقتباس میں عبارت کا آتار چڑھاؤ اور ترتیب اور گھماؤ کچھ ایسا ہے کہ کہیں اثبات ہے تو خود ہی اس کی نفی ہے اگر ان سے یا ان کے معتقد سے کوئی پوچھے تو صاف کہدیں کہ میں نے یہ کہاں کہا ہے، یا اس کے ساتھ اس جملہ کو کیوں چھوڑ دیا۔

معلوم نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعلان کو سیاسی بغاوت کیوں قرار دیا گیا اور نمرود کے عدم انکار سے وہ کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں قرآن پاک نے تو غیر مبہم طور پر نمرود کی خدائی کے دعوی کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں

اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ — میں جلاتا ہوں اور مارتا ہوں

نص قرآنی سے تو یہی ثابت ہے کہ یہ اپنے کو قادر مطلق جانتا تھا اور کہلاتا بھی تھا قرآن پاک کی مذکورہ آیت کا سب سے پہلا جملہ ہی اس کو پکار کر کہہ رہا تھا

حَاجَّ اِبْرَاهِيْمَ فِيْ رَبِّهٖ — جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں۔

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رب وہ ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے، اس کے بارے میں جھگڑا کیا تھا، یہی تو تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کی ربوبیت پر جو دلائل قائم کر رہے تھے۔ نمرود اس کا انکار کر رہا تھا اور کہتا تھا میں بھی ایسا کرتا ہوں۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ وہ خدا کا منکر نہیں تھا اس سے تو یہی ثابت ہے کہ وہ ان صفات خداوندی کا جہاں انکار کر رہا تھا ساتھ ہی اپنی خدائی کو جتلا رہا تھا۔

نص قرآنی کی اس صراحت کے بعد نمرود کے دعوی کی اصلاح اور تاویل محض اس وجہ سے کہ جناب مودودی صاحب پاکستانی سیاست سے متعلق نہیں رہے یا وہاں کے اقتدار اعلیٰ کو طاغوتی نظام کا سرغنہ

قرار دیا اس قیاس کے لئے ان کے پاس یہی تو مال مسالہ تھا کہ نمرود کے دعویٰ کی ذرا اصلاح کر کے اس کو صدر ایوب کی برابری میں لا کر کھڑا کر دیں یا صدر ایوب اور بھٹو کے اقدامات کو نمرودی اقدامات سے تشبیہ دیکر نمرود وقت قرار دیدیں۔ کجا قرآنی تفسیر اور کجا سیاسی جذبات کی تسکین یہی انکار و تاویل مودودی صاحب نے فرعون کی خدائی کے بارے میں کی ہے۔

نصوص قرآنی پر غور کرنے کے بعد ہر ایک آدمی اسی نتیجہ پر پہونچیگا کہ نمرود۔ مردود نام کی وہ شخصیت دنیا میں گذری ہے جو اپنے کو خدا کہلاتا تھا اور رب العالمین کے خدا ہونے کا انکار کرتا تھا۔

سورۂ آل عمران

غلطی کا مکرر اعادہ

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

تم نیکی کو نہیں پہونچ سکتے جب تک کہ وہ چیزیں خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو صـ۲۷۲ ج ا

اس جگہ بھی مودودی صاحب نے نہ اپنی ترجمانی میں توجہ کی ہے اور نہ تفہیم میں بلکہ وہ جذبات کے نیچے دبے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں فائدہ ۷۵ کے تحت فرماتے ہیں۔

ان کے دماغوں میں نیکی کا بلند سے بلند تصور بس یہ تھا کہ صدیوں کے توارث سے تشریع کی جو ایک خاص ظاہری شکل ان کے ہاں بن گئی تھی اس کا پورا چربہ آدمی اپنی زندگی میں اتار لے اور ان کے علماء کی قانونی موشگافیوں سے جو ایک لمبا چوڑا

فقہی نظام بن گیا تھا اس کے مطابق رات دن زندگی کے
چھوٹے چھوٹے ضمنی وفروعی معاملات کی ناپ تول کرتا رہے

(فائدہ ۵ ص ۲۶۲)

اس جگہ بھی اپنے جذبات کی تسکین کے لیے فقہی نظام اور تشریح کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے اہل کتاب میں کوئی فقہی نظام نہیں تھا برسہابرس محنت کرنے کے بعد وہ بائیبل (توریت اور انجیل کا مجموعہ) مرتب کر پائے تھے یا توریت کی تشریحات میں تلمود نامی کتاب اور بس۔ اس جگہ مودودی صاحب بظاہر تو اہل کتاب کی تردید کر رہے ہیں لیکن ایسے الفاظ سے لوگوں کے دل فقہی موشگافیوں سے متنفر ہو جائیں گے ہے

الناس اعداء بما جهلوا لوگ جس سے جاہل ہوتے ہیں
اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔

آیت مبارکہ کی ترجمانی اور تفہیم میں یہ غلطی ہے کہ "البر" کے الف لام کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ مودودی صاحب پوری کتاب میں معرفہ و نکرہ کو گویا لغو اور عبث جانتے ہیں
مِمَّا تُحِبُّونَ کا مطلب مَا تُحِبُّونَ بیان کر دیا حالانکہ قرآن پاک نے بعض مَا تُحِبُّونَ کا مطالبہ کیا ہے یعنی؛
تم نیکی میں کمال حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنی عزیز
چیزوں میں سے خرچ نہ کر دو۔
یعنی قرآن پاک نے محبوب چیز کو تمام کل کی کل خرچ کرنے کو نہیں کہا بلکہ اس میں سے بعض کو خرچ کرنے کو کہا ہے اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ جو قرآن ہر قسم کے انسانوں کے لئے ہو وہ ان کے فطری تقاضوں کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا — نہیں مکلف قرار دیتا اللہ تعالیٰ کسی انسان کو مگر اس کی وسعت بھر

اگر کوئی آدمی اپنے مرغوبات میں سے کل کو خرچ نہیں کرتا بلکہ بعض کو خرچ کرتا ہے تو کیا اس نے نیکی نہیں کمائی؟ مودودی صاحب کی تفہیم تو اس کا انکار کرتی ہے لیکن قرآن پاک کہتا ہے

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ (الآیۃ) — جو آدمی ذرہ برابر نیکی کریگا وہ اسکو دیکھے گا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے

وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا — ریشہ برابر بھی تم پر ظلم نہ ہوگا۔

ہم پھر یہی کہتے ہیں کہ ترجمانی کے زور میں قرآنی الفاظ و حروف اور حروف کے خواص کو نظر انداز کر کے بات کہنا یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

۲ — فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا — تم کو یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہیے ص۲۷ ج۱

اس جگہ بھی مودودی صاحب نے آزاد ترجمانی میں پرواہ نہیں کی اور کہہ دیا کہ یکسو ہو کر یعنی حنیف ہو کر اتباع کرو اس جگہ حنیف ابراہیم سے حال ہے اور حنیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت ہے لیکن مودودی صاحب نے اس کو حضرت ابراہیم ؑ کی صفت نہیں قرار دیا اسی لئے مودودی صاحب نے حال اور ذوالحال میں فرق نہیں کیا ہے اور یہ بہت بڑی کوتاہی ہے

۳ — قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ — وہ کہتے ہیں امیوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے ص۲۶۲ ج۱

غیر یہودی میں نصاریٰ بھی داخل ہیں۔ یہودی نصاریٰ کو امی نہیں

کہتے تھے بلکہ امیوں سے مراد ان کے نزدیک اہل عرب مسلمان تھے خاص طور سے اہل مکہ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ — وہی ذات جس نے امیوں میں ان ہی میں کا ایک رسول بھیجا

مودودی صاحب نے بات اگرچہ عام کہی ہے لیکن اگر ذرا دہ غور فرما لیتے تو یہودیوں اور اہل عرب کے درمیان جس قسم کے تعلقات تھے اس کے اوپر روشنی پڑ جاتی اس آیت میں صاف موجود ہے کہ یہودی مسلمانوں کے ساتھ (چونکہ وہ امی تھے) ہر قسم کے ظلم و خیانت کو روا اور اپنی ہر خیانت کو حق بجانب جانتے تھے۔ مودودی صاحب اس فرق پر آگاہ نہ ہو سکے

اخذ میثاق

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ — ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیم لوگوں میں پھیلانا ہوگی انہیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا صفحہ ۳۰۹ ج ۱

اس جگہ مودودی صاحب نے بائبل کے بعض اقتباسات کی وجہ سے اخذ میثاق اور اس کے بیان کرنے سے مراد تعلیمات توریت کی اشاعت[۱] لی ہے جو سراسر غلط ہے۔

اصول تفسیر میں سے یہ بھی ہے کہ اولاً قرآنی آیات کی قرآنی آیات سے پھر احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے تفسیر ہونا چاہیے اس کے بعد دیگر ذرائع سے علی الترتیب اگر ضرورت ہو اور شریعت اجازت دے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ص ۴۳۸ ج ۱ یاد رہے اس جگہ ہم نے مودودی صاحب کی دو غلطیاں الکی عربی دانی کے اظہار کیلئے ذکر کی ہیں[۲] تفہیم القرآن فائدہ ۱۳۱ کو ملاحظہ فرمائیں

قرآن پاک میں تین قسم کے اخذ میثاق کا ذکر ہے ایک اخذِ میثاق تو اولاد آدم سے تھا اور دوا خذ میثاق دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور اہل کتاب سے لیئے گئے جن میں سے ایک اخذ میثاق یہ ہے جسکا یہاں ذکر ہے اور دوسرے اخذ میثاق کا ذکر بھی سورۂ آل عمران ہی میں ہے

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ	اور جب لیا عہد اللہ نے نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا ہے کتاب اور علم پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول اور تصدیق کرے اسکی جو تمہارے پاس ہے

سورۂ آل عمران کی دو جگہ کی ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ اخذ میثاق جہاں بیان کتاب کے لئے ہے۔ (جیسا کہ مودودی صاحب نے بیان کیا) وہاں آنے والے رسول کی تصدیق اور نصرت کے بارے میں بھی ہے بلکہ قوی قرینہ یہی ہے چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی نے ابن جریر اور ابن ابی حاتم سے اور حافظ ابن کثیر نے حضرت علی رضؓ اور حضرت ابن عباس رضؓ سے یہی روایت کیا ہے۔ اور یہی روایت سعید بن جبیر اور سدی کی بھی اور یہی علامہ سبکی نے بیان کیا ہے

آیت میں رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کوئی نبی بھی ایسا نہیں گذرا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات والا صفات کے بارے میں تائید و نصرت کا عہد نہ لیا ہو۔

اور صاحب تفسیر روح المعانی نے بیان کیا ہے کہ (اسجگہ)

کلام سدی اور ابن جبیر سے ظاہر ہے کہ ضمیر کا مرجع جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔[1]

مذکورہ آیات کی یہ تفسیر اور مندرجہ بالا اقوال ایک دوسری آیت سے ماخوذ ہیں۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا	جب ان کے پاس ان کا جانا
كَفَرُوا بِهِ	پہچانا آیا تو اس کا انکار کر دیا
اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ	وہ لوگ جو اتباع کرتے ہیں رسول
النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ	نبی امی کی جس کو پاتے ہیں وہ
مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ	اپنے پاس لکھا ہوا توریت اور
وَالْاِنْجِيْلِ	انجیل میں

ان مضامین پر مشتمل تمام قرآنی آیات کو ملا کر اگر پڑھا جائے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اخذ میثاق سے مراد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں اخذ میثاق ہے

آیت پاک کی مراد بیان کرنے میں جہاں ان کے بیان کردہ مفہوم کے لئے جتنی قوی دلیلیں ہیں اتنی ہی قوی بلکہ کچھ زیادہ دوسرے مطلب کے بارے میں بھی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس جگہ لکھتے وقت مودودی صاحب کے ذہن میں انجیل برنابا نہ رہی ہو گی جس میں بکثرت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آپ کے صفات اور آپ کے متعلق بشارات ہیں اور یہ انجیل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ۷۵ سال پیشتر قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی تھی اور پوپ اعظم اور تمام عیسائی بادشاہوں نے اس کو ضبط کر لیا تھا جس کا ایک نسخہ ہالینڈ کے کتب خانہ سے حاصل ہوا اور اس کے انگلش اور عربی تراجم شائع ہوئے عربی ترجمہ ۱۹۰۶ء میں

---

[1] یہ بات جو ہم نے اس جگہ ذکر کی ہے ملاحظہ فرمائیں روح المعانی ج۳ ص۲۰۹۔ ابن کثیر ج۱ ص۳۷۹، ج۱ ص۳۸۰۔ تفسیر قرطبی ج۴ ص۱۲۵۔ تفسیر در منثور ج۲ ص۴۷۔ معارف القرآن ص۲۰ ج۲

شائع ہوا اور اردو ترجمہ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا اور اب پاکستان میں کثرت سے کتاب دستیاب ہے۔ قرآن پاک کی حقانیت پر اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یہ کتاب کھلی دلیل ہے ممکن ہے قرآن پاک میں جگہ جگہ یہ جو ارشاد فرمایا ہے

وَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ — جان بوجھ کر حق کو چھپاتے ہیں

اس سے مراد (غالباً) یہی حق تھا جسکو انہوں نے چھپا رکھا تھا یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت سے متعلق بشارات اور دلائل۔[1]

ہم نے اس بارے میں نہایت تفصیل سے بحث اپنی کتاب "محمد آخری رسول" میں کی ہے اس میں ہم نے وید، انجیل، توریت انجیل برنابا، گرنتھ، مستشرقین کی تحریروں سے دلائل پیش کئے ہیں اور آئندہ سطور میں بھی میثاقاً غلیظاً کے تحت اس کا ذکر آئیگا۔

بہرحال مودودی صاحب نے اپنی تفہیم میں ایک کھلے ہوئے حق کو اعراض کیا ہے جس کی وجہ سے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے تحقیق کے حق میں خیانت کی ہے اور آیات قرآنیہ کے بیان سے روگردانی کی ہے

---

[1] تعجب ہے ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے مودودی صاحب کی نظر اسطرف کیوں نہیں گئی؟ ہماری یہ بات بعینہٖ ایسی ہی ہے جیسا کہ مودودی صاحب نے سورۂ نساء کی تفسیر میں نمبر ۲۶ کے تحت ابو مسلم اصفہانی کے بارے میں کہدی ہے ص ۳۳۲ ج ۱

سورۃ النساء

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ — اور وہ مال جنہیں اللہ تعالیٰ نے
الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا — تمہارے لئے قیام زندگی کا ذریعہ
بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو ص۳۲۲ ج ۱

اس کے فائدہ ۶ کے تحت بیان فرمایا ہے۔

یہ آیت وسیع معنی کو حامل ہے اور اس میں امت کو یہ جامع ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مال جو ذریعہ قیام زندگی ہے بہر حال ایسے نادان لوگوں کے اختیار اور تصرف میں نہ رہنا چاہیئے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظام تمدن و معیشت اور بالآخر نظام اخلاق کو خراب کر دیں (الیٰ قولہ) اور بڑے پیمانہ پر حکومت اسلامی کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیئے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود مالکانہ تصرف کے اہل نہ ہوں یا جو لوگ اپنی دولت کو برے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں ان کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے لے اور ان کی ضروریات زندگی کا بندوبست کرے ص۳۲۳ ج ۱

بات بہت عمدہ ہے لیکن کیا یہ دوسرے کی رائے کو اپنا کر پیش کیا ہے؟ مودودی صاحب سے بہت پہلے سید محمود آلوسی نے یہی بات کہی تھی مگر افسوس ہے کہ ایسے مواقع پر مودودی صاحب ان بیچاروں کا نام تک نہیں لیتے اور ان کی بات کو اپنا فکر بنا لیتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

کہ تفسیر روح المعانی کا انہوں نے مطالعہ نہ کیا ہو[1] البتہ جہاں کہیں کوئی خامی نظر آتی ہے تو ان بے چاروں کا نام خوب اچھالتے ہیں (جیسا کہ ابھی چند سطر کے بعد سامنے آتا ہے) اور ایسے ہی وہ جہاں کسی ضعیف اور شاذ قول کو اپناتے ہیں تو پھر انہیں اپنی کمزوری چھپانے کے لئے لامحالہ دوسروں کا دامن تلاش کرنا پڑتا ہے اور اس میں مزید کرم یہ فرماتے ہیں کہ اسکو قول ضعیف کیطرح پیش نہیں کرتے اور نہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان بیچاروں نے اسکو تردید کے لئے ذکر کیا تھا۔

زنا کا حکم

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ (الی قولہ) وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا

تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو اگر چار آدمی گواہی دیدیں تو ان کو گھر میں بند رکھو! یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکالدے اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں ان دونوں کو تکلیف دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انہیں چھوڑ دو۔ ص ۳۳۱/۱

ان آیات میں زنا کا ابتدائی حکم بیان کیا گیا ہے اس کے بعد سورۂ نور میں زنا کی حد شرعی بیان کی گئی ہے۔ آیت پاک میں الفاحشہ کے مفہوم میں عمومیت کو اختیار کرتے ہوئے حضرات متقدمین نے اور اکثر مفسرین نے یہ بیان کردیا ہے کہ اس آیت سے لواطت وغیرہ کی سزا بھی ثابت ہے اور مودودی صاحب نے ان آیات کی تشریح کرتے

[1] ملاحظہ فرمائیں روح المعانی از صفحہ ۲۰۰ ج ۴ تا صفحہ ۲۰۳ ج ۴

ہوئے فائدہ ۲۶ کے تحت بیان فرمایا ہے :۔

مفسر سدی کو ان دونوں آیتوں کے ظاہری فرق سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پہلی آیت منکوحہ عورتوں کے لئے اور دوسری آیت غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے ۔ لیکن یہ ایک کمزور تفسیر ہے جس کی تائید میں کوئی وزنی دلیل نہیں ہے اور اس سے زیادہ کمزور بات وہ ہے جو ابو مسلم اصفہانی نے لکھی ہے کہ پہلی آیت عورت اور عورت کے ناجائز تعلق کے بارے میں ہے اور دوسری آیت مرد اور مرد کے ناجائز تعلق کے بارے میں ہے ۔ تعجب ہے ابو مسلم جیسے ذی علم شخص کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہ گئی کہ قرآن انسانی زندگی کے لئے قانون اور اخلاق کی شاہراہ بناتا ہے اور انہیں مسائل سے بحث کرتا ہے جو شاہراہ پر پیش آتے ہیں رہیں گلیاں اور پگڈنڈیاں تو ان کی طرف توجہ کرنا اور ان پر پیش آنے والے ضمنی مسائل سے بحث کرنا کلام شاہانہ کے ہرگز موزوں نہیں ایسی چیزوں کو اس نے اجتہاد کے لئے چھوڑ دیا ہے الخ فائدہ ۲۶

آیت کی تشریح میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اکثر مفسرین نے وہی بیان کیا ہے ۔ ابو مسلم نہیں مجاہد جیسے متقدمین نے بھی وہی بیان کیا ہے ۔

میرا منشا اس جگہ ان اقوال کی تردید نہیں ہے بلکہ مودودی صاحب کی تنقید پر نظر ہے کیونکہ آیت میں جب ایسا قرینہ موجود ہے کہ جس سے لواطت ثابت ہوتی ہے تو کیا اشکال ہے مثلاً لفظ " الفاحشہ " جیسا کہ زنا کے لئے بولا جاتا ہے ایسے ہی لواطت کے لئے بھی بولا جاتا ہے قوم لوط کے بارے میں ارشاد ہے ۔

أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا	کیا تم اس بے حیائی کا ارتکاب
سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ	کرتے ہو جس کا ارتکاب دنیا
مِنَ الْعَالَمِينَ	میں ابھی تک کسی نے نہیں کیا۔

اس جگہ الفاحشہ کا لفظ لواطت کے لئے ہے اس اعتبار سے ابو مسلم اور مجاہد کی بات گلی اور پگڈنڈی کی نہ رہی بلکہ شاہراہ کی بات ہوئی۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب متقدمین حضرات کسی آیت سے احکامات اخذ کر کے بیان کرتے ہیں تو ان کی نظر قرآن پاک کی تمام آیتوں پر ہوتی ہے اسوجہ سے فاحشہ کا لفظ بدکاری کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے خواہ وہ زنا ہو یا لواطت ہو۔ دوسرا قرینہ اسم موصول ہے۔ اَلَّذَانِ۔ تیسرا قرینہ فَآذُوْهُمَا ہر اس میں اذیت کا ذکر ہے اور اذیت کی کوئی حد شرعی نہیں ہے یہ اجتہاد اور رائے امام پر محول ہے۔ محترم! اجتہاد ہوتا ہی اس جگہ ہے جہاں اس کے لئے کوئی قرینہ یا گنجائش ہو جیسا کہ حضرات صحابہ رضؓ سے لواطت کے بارے میں مختلف سزائیں منقول ہیں اور ہر ایک نے جو سزا تجویز کی ہے اس کا مقیس علیہ بھی ہے یہی حال ائمہ کرام کا ہے رہی یہ بات جو ہمارے محترم مودودی صاحب نے بیان کی ہے

> صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی یہ نہ سمجھا کہ سورۂ نساء کی اس آیت میں اس کا یہ حکم موجود ہے۔

لیکن یہ بات حکم صریح کے بارے میں تو کہی جا سکتی ہے کہ جس کی کوئی حد مقرر ہو یہاں اذیت کی کوئی حد مقرر نہیں حضرات صحابہ رضؓ نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے لواطت کی حد مقرر کرانا چاہی تھی مگر انہوں نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی تھی اس لئے ابو مسلم اور مجاہد نے ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ جو قوم لوط کے بارے میں مکہ معظمہ میں نازل ہو چکی تھیں سورۂ نساء کی تفسیر میں لواطت وغیرہ مراد لے لیں تو کیا ظلم ہوا انہوں نے

واطت کی کوئی حد شرعی تو مقرر نہیں کی بلکہ اسکو اجتہاد امام پر چھوڑ دیا

اس جگہ مودودی صاحب سے ہمیں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ وہ آیات کا شان نزول بیان کرنے میں اپنی مرضی کے پابند ہیں بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ جہاں اگر شان نزول کو بیان کر دیا جائے تو قرآن پاک کو اس پس منظر کے ساتھ سمجھنے میں بہت مدد ملے

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ	تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں
لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ	اللہ ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ
	دو عورتوں کے برابر ہو $\frac{۳۲۵}{۱}$

اس آیت کی تشریح فائدہ ۱۲ میں بیان کی ہے

حدیث میں آیا ہے کہ جنگ احد کے بعد حضرت سعد بن ربیع کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لئے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ سعد کی بچیاں ہیں جو آپ کے ساتھ احد میں شہید ہو گئے ہیں ان کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لئے ایک حبہ تک نہیں چھوڑا۔ اب بھلا بچیوں سے کون نکاح کریگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی

حقیقت حال یہ ہے کہ مذکورہ آیت مبارکہ کے تین سبب نزول بیان کئے ہیں۔

۱۔ ابن جریر نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اہل شرک کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ اہل جاہلیت (مشرکین) میراث میں ان ہی لوگوں کو شریک کرتے تھے جو جنگ کی صلاحیت رکھتا ہو نابالغ بچوں اور لڑکیوں کو کچھ بھی نہیں دیتے تھے چنانچہ جاہلیت کا یہ قانون منسوخ کر دیا گیا ... آلوسی نے ذکر کیا ہے

۲۔ اس کے علاوہ دوسرا سبب نزول یہ ہے کہ جس کو اصحاب ستہ (بشمول امام بخاری رح) نے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا کہ میں بیمار تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ بنی سلمہ میں میری عیادت کے لئے آئے اور اس وقت مجھے ہوش نہ تھا آپ نے پانی مانگا اور وضو کیا اور پھر پانی کو میرے اوپر چھڑکا تو مجھے ہوش آگیا اس وقت میں نے عرض کیا آپ میرے مال کے بارے میں فرمایئے کہ میں کیا کروں اسوقت یہ آیت نازل ہوئی۔

۳۔ تیسری یہ روایت ہے جس کو مودودی صاحب نے نقل کیا ہے اور ناظرین جانتے ہیں کہ اس جگہ دوسری روایات کو چھوڑدیا اور ایک ایسی روایت کو اختیار کرلیا ہے جس سے صحابہ رضؓ کے ظلم کا ایک پہلو مترشح ہوتا ہے حالانکہ روایت کے الفاظ اس کے بعد بھی ہیں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بچیوں کے چچا کے پاس خبر بھیجی اور فرمایا دو ثلث سعدؓ کی بچیوں کو آٹھواں حصہ اسکی بیوی کو دیدو اور باقی حصہ تمہارا ہے[1]

اس پوری روایت کو بیان کرنے سے نہ صرف شان نزول معلوم ہوا بلکہ حضرات صحابہ کی حق پسندی بھی ظاہر ہوگئی

ابن جریر والی روایت کو نقل کرنے کے بعد صاحب تفسیر روح المعانی نے جو تبصرہ کیا ہے وہ نہایت جامع اور معقول ہے فرماتے ہیں:

عموم الفاظ کا اعتبار ہے خصوص سبب کا نہیں اگر یہ آیت اہل شرک کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو یہ بات مناسب ہے

عرض کرنے کا منشا اس قدر ہے کہ مودودی صاحب نے ایسا مزاج پایا ہے کہ انتخاب میں ہمیشہ ایسے ہی اجزاء کیطرف ان کی نظر جاتی ہے جس سے کوئی برائی کا پہلو ظاہر ہو جائے محاسن کی طرف بہت کم نظر جاتی ہے۔

[1] روح المعانی [illegible] ابن کثیر [illegible]

وہ اپنی تفسیر میں شان نزول بیان کرنے کے بھی عادی نہیں ہیں کہیں کہیں بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی ان کی نظر انتخاب کو دخل ہے اس جگہ بھی انہوں نے ایسا ہی کیا ہے اور بقیہ روایات کو چھوڑ دیا ہے اور جو روایت لی ہے وہ بھی آدھی ذکر کی ہے آدھی حذف کر دی تاکہ حضرات صحابہ کا ظلم خوب آشکارا ہو جائے اور لوگ خیال کرنے لگیں کہ وہ (نعوذ باللہ) بہت ظلم تھے

سلطان مبین | وَآتَيْنَا مُوسٰے — ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا

سُلْطَانًا مُّبِينًا (صـ۱۴۶ ج ۱)

اس کی تشریح میں فائدہ ۱۸۲ کے تحت بیان فرماتے ہیں ؛

> صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسےؑ کو تختیوں پر لکھ کر دئے گئے تھے۔ سورۂ اعراف رکوع ۱۷ میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آئیگا۔ صـ۲۱۶ ج ۱

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھی ہوئی کیا چیز ملی تھی اس کے بارے میں صـ۱۸۹ ج ۱ میں فرماتے ہیں

> تبرکات جو اس صندوق میں رکھے ہوئے تھے ان سے مراد پتھر کی وہ تختیاں ہیں جو طور سینا پر حضرت موسیٰؑ کو دی گئیں تھیں اسکے علاوہ توریت کا وہ اصل نسخہ بھی اس میں تھا جسے حضرت موسیٰ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سپرد کیا تھا فائدہ ۲۷۰

توریت کیا ہے اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے صـ۲۳۲ ج ۱ فائدہ ۲ میں تحریر فرمایا ہے ؛-

> دراصل توراۃ سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لیکر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے ان میں سے دس احکام تو وہ تھے

جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کرا کے انہیں دئے تھے باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لکھوا کر اس کی ۱۲ نقلیں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو دیدی تھیں ص۲۳۱ ج ۱ پس دراصل اب توراۃ ان منتشر اجزاء کا نام ہے جو سیرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں ہم انہیں صرف اس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران جہاں کہیں سیرت موسیٰ کا مصنف کہتا ہے خدا نے موسے سے یہ فرمایا، یا موسیٰ نے کہا خداوند تمہارا خدا یہ کہتا ہے

(ص ۲۳۲ ج ۱)

یہ اقتباسات ایک دوسرے کی شرح کرتے ہیں ان کے نقل کرنے سے غرض صرف اس قدر ہے ——— کہ فرمان صریح سے مراد توریت یا توریت کا ایک جزء ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا تھا، یہ وہ بات ہے جو اصول ۱۲ کے تحت مودودی صاحب نے عبارت قرآن سے خود سمجھی اور غور کرنے کے بعد جو چیز ان کے ذہن میں آئی ہے سلطان مبین کی یہ ایسی تشریح ہے جو اُن کی اپنی گھڑی ہوئی ہے۔ تفسیر کی کسی کتاب یا لغت کی کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ سلطان مبین کی یہ تشریح بیان کرنے میں قرآن پاک اور احادیث (اور اس سے بھی زیادہ بڑھ کر ہم کہتے ہیں) بائیبل سے بھی کوئی قرینہ نہیں ملتا ہے۔ اب کے بعد ہم سلطان مبین کے جو معنی مفسرین نے بیان کئے ہیں اس جگہ ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ معتبر اور واضح قول یہی ہے

۱۔ سلطان مبین سے مراد ظاہری تسلط اور غلبہ ہے الخ

۲۔ یا حجت ظاہرہ مراد ہے اور وہ نو آیات ہیں۔ صد ا

پہلے قول کو صاحب تفسیر روح المعانی نے اختیار کیا ہے نو آیتوں کی تعیین میں کافی اختلاف ہے کہ وہ کون کون آیات ہیں[۱] اور پہلے ہی قول کو علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی اختیار کیا ہے بات دراصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل جیسی نافرمان قوم کہ اس کی پوری تاریخ نافرمانیوں سے بھری پڑی ہے جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور سامری کے پیچھے ہو گئے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس کفر و شرک کی یہ سزا مقرر کی کہ مجرمین آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں یا ان کو قتل کر دیا جائے یعنی ان کی توبہ قتل نفس مقرر ہوئی چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے (بذریعہ موسیٰ علیہ السلام) ایک دن میں ستر ہزار قتل ہوئے۔ ایسے نافرمانوں پر قتل نفس کے معاملہ میں حضرت موسیٰ ؑ کا ان پر غلبہ پانا اور حکم نافذ کر دینا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک آدمی کو کھلا ہوا غلبہ (سلطان مبین) ہے جس کو بطور انعام یا احسان کے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ایک کھلا ہوا معجزہ بھی ہے[۲]۔ اس کے بعد اب عبارت قرآن سے بھی اس کے معنی متعین فرمائیے یہی ہیں[۳] اور کچھ نہیں۔

۱۔ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَٰلِكَ وَآتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطَانًا مُبِينًا (نساء)	پھر بنا لیا انہوں نے بچھڑے کو اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلے ہوئے نشانات آ چکے تھے پس ہم نے انکو معاف کر دیا اور موسیٰ ؑ کو کھلا ہوا غلبہ عنایت کیا

[۱] جلالین صد ۹ [۲] ملاحظہ فرمائیں فوائد عثمانی حاشیہ جلالین شریف۔ [۳] روح المعانی

۲- وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (البقرہ)

اور فرمایا موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے تم نے بچھڑہ بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے پس اپنے رب کی طرف توبہ کرو پس قتل کرو اپنے نفسوں کو الخ

۳- اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الاعراف)

جنہوں نے بچھڑے کو بنایا عنقریب ان کو ان کے رب کا غضب ملیگا اور دنیا میں ان کو ذلت نصیب ہوگی

قرآن پاک میں واقعات کو تاریخی ترتیب سے بیان کرنا کوئی ضروری نہیں ہے کیونکہ قرآن پاک تاریخ کی کتاب نہیں ہے تاہم قرآن کی مذکورہ آیات اور دیگر آیات سے یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی توبہ (قتل) گوسالہ پرستی کے بعد ہوئی ان پر یہ سزا جاری کرنے اور خدا کا حکم نافذ کرنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک کھلا ہوا تسلط اور غلبہ حاصل ہوا اس جگہ فرمان صریح اس کا ترجمہ کرنا نہایت غیر مناسب اور غیر سنجیدہ ترجمہ ہے۔ قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ ہے۔ یہ بطور دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے۔

وَاجْعَلْ لِّىْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا

اور اے اللہ! اپنے پاس سے مجھے مدد والا غلبہ مرحمت فرمایئے

الحاصل سلطان مبین کا ترجمہ اور تشریح فرمانِ صریح ہرگز نہیں ہوسکتی۔ واللہ اعلم۔

قتل مسیح علیہ السلام

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا

اور خود کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	کو قتل کر دیا حالانکہ فی الواقع
رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ	انہوں نے نہ ان کا قتل کیا نہ
وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ	صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ انکے
لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا	لئے مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں
فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا	نے اس کے بارے میں اختلاف
لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا	کیا ہے وہ بھی دراصل شک
اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ	میں مبتلا ہیں ان کے پاس
يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ	اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے
اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا	محض گمان ہی کی پیروی ہے
حَكِيْمًا وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ	یقیناً انہوں نے مسیح کو قتل
الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ	نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسکو اپنی
قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ	طرف اٹھا لیا۔ اللہ تعالیٰ زبردست
يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا	طاقت رکھنے والا حکیم ہے اور

اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا کہ جو اس کی
موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئیگا اور قیامت
کے روز وہ ان پر گواہی دیگا

ص۴۱۱ ج ۱ لغایۃ ص۴۲۱ ج ۱ ۔ تفہیم القرآن

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع
الی السماء کو بیان فرمایا ہے اور یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی تردید
فرمائی ہے کہ انہوں نے اپنے خیال کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کو قتل کر دیا تھا اس مسئلہ میں مودودی صاحب نے یہاں تک دو جگہ
تفصیل سے بحث کی ہے

ا۔ سورۂ آل عمران میں۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ

دَرَافِعُکَ اِلَیَّ ۔ فائدہ ۵۱ صـ ۲۵۷ ج ۱ میں

۲۔ سورۂ نسار میں ان آیات کے تحت فائدہ ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷۔ ہمارے نزدیک انہوں نے معاملہ کو صاف کرنے کے بجائے غیر ضروری مباحث لاکر الجھا دیا ہے اور جن متوسط اردوداں حضرات کے لئے کتاب کو لکھا ہے بات دو ٹوک نہیں کہی انہوں نے اگرچہ غلطی کرنے میں ذرا احتیاط کی ہے لیکن تحقیق کے معیار پر ان کے بیان میں غلطیاں بھی ہیں اور مغالطہ بھی ہے ہم اس جگہ ان کی کتاب سے پورا اقتباس نہیں بلکہ ان کا منشار اور نچوڑ بیان کرینگے تاکہ طول ہونے کی بنار پر بات الجھاؤ میں نہ آجائے۔ انہوں نے تحریر فرمایا ہے :۔

۱۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّیکَ کا لفظ استعمال کیا ہے (رکوع ۶) لیکن جیسا کہ ہم حاشیہ ۵۱ میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ لفظ طبعی موت کے معنی میں صریح نہیں ہے بلکہ قبض روح اور قبض روح وجسم دونوں پر دلالت کرسکتا ہے صـ ۴۲۱ ج ۱

۲۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا اٹھا لینے کی کیفیت قرآن نے نہیں بتلائی کہ اللہ تعالیٰ ان کے جسم اور روح کو اٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا۔ فائدہ ۱۹۵

۳۔ عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و روح سمیت اٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ان اسباب میں سے تھا کہ جن کی بنار پر ایک بہت بڑا گروہ الوہیت مسیح کا قائل ہوا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہ وہی رفع کا لفظ استعمال کیا ہے جو عیسائی اس واقعہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

کتاب مبین کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کی مزید تقویت پہونچانے والی ہو فائدہ [له] ۱۹۵

۴۔ آیت مبارک لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ الخ کے تحت بیان فرماتے ہیں اس فقرے کے دو معنی کئے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا یکساں احتمال ہے ایک معنی وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کئے ہیں دوسرے یہ کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح پر ایمان نہ لے آئے اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہل کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالت مسیح کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ مسیح پر ایمان لے آتے ہیں مگر یہ اسوقت ہوتا ہے کہ جب ایمان لانا مفید نہیں ہوتا دونوں معنی متعدد صحابہ رض اور تابعین اور اکابرین مفسرین سے منقول ہیں

مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں متعدد جگہ بیان کیا ہے۔

۱۔ قرآن پاک میں جزئیات سے بحث نہیں کی گئی ہے (یعنی بیان واقعہ بقدر مقصود پر اکتفا کیا ہے)

۲۔ قرآنی عبارت میں یہ اعجاز و کمال ہے کہ الفاظ کم اور معنی کثیر۔

۳۔ مودودی صاحب نے بہت جگہ کسی تفصیل کو بیان کرنے میں بائیبل سے بھی استفادہ کیا ہے

ان گذارشات کے بعد مودودی صاحب کی تفہیم پر ہمارا تبصرہ یہ ہے

له غور فرمائیں یہ عبارت کتنی غیر معیاری ہے یہ قرآن پر اعتراض ہے یا عیسائیوں کے عقیدہ کی تصدیق ہے یا اور کوئی چیستان ہے؟۔ [له] ہم نے بہت خلاصہ کیا ہے تفصیل مندرجہ بالا نمبرات کے تحت ملاحظہ فرمائیں ہم نے اپنے تبصرہ میں خلاصہ اور تفصیل دونوں کو مدنظر رکھا ہے۔

کہ اگر قرآن پاک نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کی کیفیت یا مُتَوَفِّیْكَ کی تفصیل کو بیان نہیں کیا تو کیا ہوا ان کی ولادت سے متعلق کیفیت علوق (یعنی نفخ روح رحم مادر) کو بھی بیان نہیں کیا اللہ تعالٰے نے ان کے وجود کو (از پیدائش تا وفات) عجوبہ روزگار بنا دیا اور دونوں کو اپنی قدرت کاملہ کا مظہر بنایا ہے جب ابتداء ہی پر کوئی اعتراض یا مطالبہ تفصیل نہیں تو آخر میں کیوں

یہ مودودی صاحب کے مزاج کی بات ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بہت ہی کم آثار اور احادیث کی طرف توجہ کرتے ہیں اگر انہوں نے توجہ کی ہوتی تو ان کو قدرے تفصیل معلوم ہو جاتی اور ایسے ہی اگر وہ انجیل برنابا کا مطالعہ فرما لیتے اس سے بھی قدرے تفصیل معلوم ہو جاتی

مودودی صاحب کے یہاں کرامات اولیاء یا توجہات انعکاسی محائلی ایک ڈھونگ مان لی گئی ہیں اہل تفسیر حضرات صحابہ رض کے آثار و روایات کو وہ ذکر تو کرتے ہیں لیکن بہت کم ۔ ہر جگہ فہم ہی سے معاملہ کی تہ تک پہونچنا چاہتے ہیں اور یہ بات علوم منقولی کی شرح کا مزاج قبول نہیں کرتا اسی وجہ سے وہ اکثر جگہ بہت موٹی موٹی غلطیاں کر جاتے ہیں مذکورہ آیت کی ترجمانی میں انہوں نے ابتداء ہی میں غلطیاں کرنی شروع کر دی ہیں جن کی وجہ سے وہ آخر میں بوکھلا گئے اور یہ کہہ کر نکل گئے کہ قرآن پاک میں اس کیفیت کی کوئی تفصیل نہیں ہے ۔

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ

اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا (شیخ الہند)

اس ترجمہ میں اور مودودی صاحب کی ترجمانی میں کتنا فرق ہے انہوں نے لکھا ہے " اور خود کہا " یہ ماضی کا ترجمہ ہے حالانکہ عبارت قرآن میں

مصدر ہے اور شیخ الہند رح نے مصدر ہی کا ترجمہ کیا ہے۔ اسی وجہ سے مودودی صاحب نے آگے چل کر غلطی کی ہے جو یہ لکھدیا ہے:

یعنی جرأت مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے (الی قولہ) بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بنکر آیا ہے ص۴۱۸ ج۱ فائدہ ۱۹۱

مودودی صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہود بھی آپ کو اللہ کا رسول مانتے تھے حالانکہ مندرجہ بالا آیت میں یہ ان کا قول تمسخر کے طور پر تھا یعنی ہم نے اس شخص کو قتل کر دیا جو رسول اللہ ہونے کا مدعی تھا۔ اس تمسخر اور استہزاء کی مثال قرآن پاک میں اور جگہ بھی ہے مثلاً مشرکین کے قول کو اللہ تعالےٰ نے نقل فرمایا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ — اے وہ شخص جس پر قرآن اترا ہے بیشک تو مجنون ہے

یعنی مشرکین نے نہ حضور کے رسول ہونے پر یقین کیا تھا اور آپ کے اوپر جو کچھ اترتا تھا اس کو کلام الہٰی بھی نہیں مانا تھا یہی یہودیوں کا حال تھا یعنی اس جگہ انہوں نے جو عیسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ کہا ہے وہ تسلیما نہیں بلکہ استہزاءً ہے۔

وَلَكِن شُبِّهَ لَهُمْ — بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا ص۴۲۱ ج۱ تفہیم

شُبِّہ کے معنی مشتبہ ہونے کے نہیں ہیں لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں قتل مسیح علیہ السلام کا معاملہ یہودیوں کے لئے مشتبہ ہو گیا اردو میں مشتبہ کے معنی شک میں مبتلا ہونے کے ہیں قرآن پاک نے یہ فرمایا ہی نہیں ہے بلکہ قرآن پاک کی عبارت کے معنی وہ ہیں جو حضرت

شیخ الہند رح اور دیگر مفسرین نے کیے ہیں لہ

اور لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے (شیخ الہند)

اس ترجمہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ کی قدرے تفصیل سامنے آجاتی ہے یعنی اتنا تو ظاہر ہو ہی گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اور یہودیوں کے عقیدہ مسیح کے بارے میں کوئی واقعہ ایسا ضرور پیش آیا ہے کہ کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شبیہ بنا دیا اور یہودیوں نے ان کو مسیح ہی یقین کرتے ہوئے قتل کر دیا

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ	انہوں نے نہ اس کو قتل کیا
وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ	اور نہ سولی پر چڑھایا لیکن
	وہی صورت بن گئی انکے آگے

اس کی تفصیل احادیث میں بھی موجود ہے اور انجیل برنابا میں فصل ۲۰۸ لغایتہ ۲۲۲ میں بھی اس کی پوری تفصیل ہے اشارتاً چند جملے نقل کرتا ہوں۔

اور جبکہ سپاہی یہودا کے ساتھ اس جگہ کے نزدیک پہونچے جس میں یسوع تھا۔ یسوع نے ایک بھاری جماعت کا نزدیک آنا سنا تب اسی لئے وہ ڈر کر گھر میں چلا گیا اور گیارہوں (شاگرد) سو رہے تھے پس جبکہ اللہ نے اپنے بندہ پر خطرہ کو دیکھا اپنے سفیروں جبرئیل اور میکائیل اور رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ یسوع کو دنیا سے لے لیویں۔ تب پاک فرشتے آئے اور یسوع کو دکھن کی طرف دکھائی دینے والی کھڑکی سے لے لیا پس وہ اس کو اٹھا لے گئے اور اسے تیسرے آسمان

لہ تفسیر ابن کثیر ص ۵۷۴ ج ۱، مظہری ص ۲۷۰ ج ۲ من النسائی عن ابن عباس رض۔ روح المعانی ص ۱۰ ج ۶ رواہ ابن المنذر عن ابن جبیر

میں ان فرشتوں کی صحبت میں رکھدیا جو ابد تک اللہ کی
تسبیح کرتے رہیں گے لہ

انجیل برنابا کا پتہ تو اب سولھویں صدی عیسوی میں ہوا ہے علماء اسلام
نے بہت پہلے احادیث اور آثار و نیز عبارت قرآن کے ذریعہ یہی بات
کہی ہے ملاحظہ فرمائیے مندرجہ حاشیہ تفسیرات ۔

علامہ ابن کثیر، علامہ آلوسی، قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے حوالہ کے
ساتھ بیان کیا ہے کہ جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا
گیا وہ بین الیقظ والنوم تھے۲ واقعہ کی یہ تفصیل سامنے آنے کے بعد
آیت مبارکہ "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ الخ" کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے :-

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ	جب آپ نے مجھے وفات دی
الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ	تو آپ ہی ان پر نگراں تھے

ان دونوں آیتوں کو ایک جگہ ملا کر پڑھیئے! تو وفات، رفع الی
السماء کا مطلب کھل جائیگا اور بات وہی قرار پائے گی کہ جو ہمارے مفسرین
نے اور برناباس نے بیان کی ہے۔ قرآن پاک نے نوم کے لئے بھی وفات
کا لفظ استعمال کیا ہے :

هُوَ الَّذِیْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِاللَّيْلِ	وہی ذات جو تمہیں رات کو وفات دیدیتی ہے

یہاں وفات سے مراد نیند ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیساتھ
یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ سو رہے تھے اور کچھ بیدار بھی تھے کہ اس
لئے مودودی صاحب نے جو دور از کار تاویلات کو اختیار کیا ہے وہ نامناسب

لہ انجیل برنابا فصل ۲۱۵ ۲ے مظہری صفحہ ۵۶ ج ۲ جواہر القرآن صفحہ ۱۱۶ ج ۲

بھی ہیں اور کمزور بھی، اور یہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانا اور یہاں سے چلا جانا دونوں ہی عجوبۂ روزگار میں سے ہیں اس لئے ابتداء ہی کے لئے کوئی کیفیت درکار نہیں تو آخر کے لئے بھی عدم کیفیت ہی پر یقین رکھنا چاہیئے اور قرآن پاک نے توبقدر ضرورت کیفیت اور تفصیل بیان کر دی ہے احادیث و آثار اور انجیل برنا باسے اس کی تائید ہی ہوتی ہے وہ تفصیل جو اجمال کی مخالف نہ ہو بلکہ اجمال کی حقیقت کے مطابق ہو وہ مضر بھی نہیں ہے

وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ	اور ہر ایک اہل کتاب حضرت
لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ	عیسےٰ علیہ السلام پر اس کی موت
وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ	سے پہلے ضرور ایمان لائینگے اور
عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا	وہ قیامت میں ان پر گواہ ہوگا

آیت مبارکہ میں لَیُؤْمِنَنَّ سے اشارہ ہے کہ ایسا ضرور ہوگا اور اس کے خلاف نہیں ہو سکتا آیت میں ضمیروں کا مرجع متعین کرنے میں تفصیل ہے یعنی مندرجہ ذیل مرجع ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ایمان لائینگے اللہ تعالےٰ پر (۲) ایمان لائینگے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (۳) ایمان لائینگے حضرت عیسےٰ علیہ السلام پر ان کے مرنے سے پہلے (۴) ہر ایک اہل کتاب اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسےٰ علیہ السلام پر ضرور ایمان لائیگا ان تمام احتمالات کے لئے قرآن اور احادیث اور آثار و نیز آیات قرآنی کے ذریعہ بیان کردہ اقوال میں ہم نے ان تفسیروں کے نام اور صفحات حواشی میں لکھ دیئے ہیں

تفسیر میں اہل کتاب کے معنیٰ کو اگر عمومیت دیدی جائے اور اس میں مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا جائے (کیونکہ مسلمان بھی اہل کتاب ہیں) تو معنی میں بہت وسعت ہو جائے گی اس طرح حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا

قیامت کے قریب نازل ہونا دلالۃ النص سے ثابت ہو گیا کہ جس کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔

سورۃ انعام

معرفت رسول

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ

اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ اور جس جس کو یہ پہونچے سب کو متنبہ کروں کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں۔ کہو! میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا کہو خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اسی طرح غیر مشتبہ طور پر پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا مگر جنہوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے ص ۵۲۹ ج ۱

ان آیات کی تشریح میں جناب مودودی صاحب نے فائدہ ۱۴ کے

تحت بیان کیا ہے

یعنی کتب آسمانی کا علم رکھنے والے اس حقیقت کو غیر مشتبہ طور پر پہچانتے ہیں کہ خدا ایک ہی ہے اور خدائی میں کسی کا کوئی حصہ نہیں جس طرح کسی کا بچہ بہت سے بچوں میں ملا جلا کھڑا ہو تو وہ الگ پہچان لیگا کہ اس کا بچہ کون سا ہے اسی طرح جو شخص کتاب الٰہی کا علم رکھتا ہو وہ الوہیت کے متعلق لوگوں کے بے شمار مختلف عقیدوں اور نظریوں کے درمیان بلا کسی شک واشتباہ کے یہ پہچان لیتا ہے کہ امر حق کونسا ہے

ص ۵۲۹ ج ۱

ہماری بحث مندرجہ ذیل آیت میں ضمیر غائب کے مرجع سے متعلق ہے جس کو مودودی صاحب نے غیر ضروری جانتے ہوئے نظر انداز کر دیا ہے

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ	جن کو ہم نے کتاب دی ہے
یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ	وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔

بلا استثناء تمام مفسرین نے ضمیر غائب (یَعْرِفُوْنَهٗ) کا مرجع جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے اور اس مرجع کی تائید میں صحیح احادیث بھی ہیں۔

ابو حمزہ اور دوسرے حضرات نے روایت کیا ہے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت عمر رضؓ نے حضرت عبداللہ بن سلام سے دریافت کیا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے کہ اہل کتاب یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا

یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَھُمْ یہ معرفت کس طرح حاصل ہوئی؟ ابن سلام نے کہا ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات کے ذریعہ شناخت کر لیا جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں جیسا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے بچہ کو بہت سے بچوں کے درمیان شناخت کر لیتا ہے اور ابن سلام خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بچوں کو شناخت کرنے سے زیادہ پہچانتا ہوں کیونکہ میں نہیں جانتا کہ بچہ کی ماں نے کیا کیا ہو گا حضرت عمرؓ نے فرمایا بیشک تم واقف ہو اور تم نے سچ فرمایا ہے [1]

قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیت کی مندرجہ بالا تفسیر کے خلاف تشریح کرنے کے لئے کوئی وجہ معقول ہونا چاہیئے قرآن کی عبارت اور اس کا سیاق و سباق بول رہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ سے مراد کوئی شخصیت ہے نہ کہ ضمیر کا وہ مرجع جو مودودی صاحب کی تشریح سے ثابت ہو رہا ہے، ضمیر غائب کو متعین کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کلام سابق میں کسی ذات یا اسم کا ذکر ہو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس شخصیت کا وجود ذہن میں ہوتا ہے یا عظمت و شان کی وجہ سے اسم کو حذف کر دیا جاتا ہے اور محض ضمیر سے کام لیا جاتا ہے جیسا کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اور دیگر متعدد آیات میں یہی طرز خطاب ہے علمائے معانی و بیان نے اس کے اسرار اور لطائف بھی بیان کر دیئے ہیں۔ اگر ضمیر کا مرجع وہی مفہوم یا حقیقت ہو جو مودودی صاحب نے بیان کیا ہے تو عبارت قرآن یوں ہونا چاہئے تھی "یَعْرِفُوْنَھَا" لیکن ایسا نہیں ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی نے آیت پاک کی تشریح میں زَعَمَ بَعْضُھُمْ (بعض کا خیال ہے) کہہ کر بعد میں وہ قول بھی ذکر کر دیا ہے جس کو

---

[1] روح المعانی ج ۲ ص ۱۳ جواہر القرآن ج ۲ ص ۲۶ ابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۶ مظہری ج ۲ ص ۲۵ جلالین ص ۲۱ تفسیر کبیر ج ۴ ص ۳۱ تفسیر ابی سعود ج ۱ ص ۴۳

مودودی صاحب نے اختیار کیا ہے (اگرچہ مودودی صاحب نے اسکو اپنا ہی فکر سلیم قرار دیا ہے) لیکن زعمہ سے ظاہر ہے کہ یہ تاویل بہت کمزور ہے اور صرف بعض کی ہے[1] اور یہ مودودی صاحب کی اپنی تفسیر میں عادت ہے کہ وہ کمزور قول کو اختیار کرکے اس کو بانس پہ چڑھا دیتے ہیں گویا بڑی تحقیق فرمائی ہے

ہمیں افسوس ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے اصول ۳ کو اس قدر نبا ہا ہے اور اپنی فکر و فہم پر اتنا اعتماد کیا ہے کہ بہت جگہ نصوص کا انکار اور تردید لازم آتی ہے یہ بھی نہیں کہ انہوں نے کسی جگہ آیات کے مطالب ایک سے زیادہ بیان نہ کیے ہوں اور جہاں انہیں اپنی فکر و فہم کو ثابت کرنا ہوتا ہے وہ شرعی حقائق سے اعراض کر جاتے ہیں (جیسا کہ سطور بالا اور ماقبل میں اعراض ہے) اور اشارہ بھی نہیں دیتے۔

مودودی صاحب موقع بے موقع اپنی تشریحات میں بائبل اور انجیل کا بہت حوالہ دیتے ہیں (اور یہ محض ان کی خوش فہمی ہے) اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی نشانیوں کو اس آیت کی تشریح میں بیان کرنا چاہتے تو بائبل اور انجیل برنباس میں بہت ذخیرہ موجود پاتے اس طرح متوسط اردو داں (جو ان کے مخاطب ہیں) پر بڑا احسان ہوتا لیکن وہ اس سے اعراض کر گئے۔

---

[1] روح المعانی ص۱۳۰ ج ۲۔

الاعراف

عصائے موسیٰ اور سحر

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ	ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک
اَلْقِ عَصَاكَ فَاِذَا هِىَ	اپنا عصا، اس کا پھینکنا تھا
تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ	کہ آن کی آن میں اس جھوٹے
فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا	طلسم کو نگلتا چلا گیا اس طرح
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ	جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور
	جو کچھ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ

باطل ہو کر رہ گیا ص ۶۹ ج ۲

آیت مبارکہ کے ترجمہ کی تشریح میں فائدہ نمبر ۹۰ میں تحریر فرماتے ہیں

یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہے کہ عصا ان لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا جو جادوگروں نے پھینکی تھیں اور سانپ اور اژدہے بن کر نظر آ رہی تھیں۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ عصا نے سانپ بن کر ان کے طلسم فریب کو نگلنا شروع کر دیا جو انہوں نے تیار کیا تھا اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانپ جدھر جدھر گیا وہاں سے جادو کا وہ اثر کافور ہوتا چلا گیا جس کی بدولت لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں کی طرح لہراتی نظر آتی تھیں اور اس کی ایک گردش میں جادوگروں کی ہر لاٹھی لاٹھی،

اس اقتباس اور سورۂ طٰہٰ کے فائدہ ۴۲ میں مودودی صاحب کی رائے یہی ہے کہ عصار موسیٰ علیہ السلام نے سانپ بن کر جادوگروں کے جادو کے اثر کو دور کر دیا اور جادوگروں کی لاٹھیاں اور رسیاں جو سانپ نظر آ رہی تھیں وہ بدستور اپنی اصلی حالت پر ہی رہیں صرف سحر اور جادو کا اثر دور ہوا۔ یہ ان کی رائے بالکل غلط ہے قرآن پاک کی عبارت کی موجودگی میں اپنی رائے کی تائید کے لئے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہونا چاہیئے تھی۔ (کم از کم بائیبل ہی کی سہی جس کا حوالہ دینے کی ان کو عادت سی ہوگئی ہے) لیکن اپنی فہم پر بھروسہ کے لئے اتنی دلیری ہے کہ اپنی رائے اور گمان کو سچ ثابت کرنے کے لئے کہدیا ہے کہ ان کی رائے میں قرآن پاک بھی یہی کہہ رہا ہے

اولاً تو عبارت قرآن ہی سے یہ ثابت ہے کہ جادوگروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کا سرے سے وجود ہی باقی نہیں رہا تھا کیونکہ "تَلْقَفُ" کے معنی حقیقی جلدی سے کسی چیز کو نگل جانے کے آتے ہیں [1] اس لفظ کے معنی حقیقی سے عدول کرنے کے لئے کوئی وجہ ہونی چاہیئے معنی حقیقی کر تو یہی ثابت ہے کہ رسیوں اور لاٹھیوں کا سرے سے وجود ہی باقی نہ رہا تھا۔ ثانیاً فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ۔ بطل سے بھی یہی ثابت ہے کہ جو چیز سامنے تھی وہ اپنی اصل ہی کے اعتبار سے ختم ہوگئی اس کا وجود بھی باقی نہ رہا [2] مودودی صاحب کی رائے کو قوت اسوقت حاصل ہو جاتی اگر بطل کی جگہ فَسَدَ ہوتا یعنی فاسد کر دیا جادو کے اثر کو لیکن بَطَلَ کا صیغہ بول رہا ہے کہ لاٹھیوں اور رسیوں تک کا وجود باقی نہ رہا تھا سب کو عصا موسیٰ علیہ السلام نے نگل لیا تھا

اصطلاح شرع اور (لغت میں بھی) باطل اور فاسد میں یہی فرق ہے

---

[1] بیضاوی صفحہ ۱۶۵ ج ۲ [2] لغات القرآن صفحہ ۳۶ ج ۲

مثلاً نماز فاسد ہو گئی یا نماز باطل ہو گئی۔ بیع فاسد اور بیع باطل۔ فاسد میں اس چیز کا قدرے وجود رہتا ہے اور باطل میں سرے سے وجود ہی نہیں رہتا اور اگر یہی بات ہے جو مودودی صاحب نے بیان کی ہے کہ جادوگروں کے جادو کا اثر بالکل ختم ہو گیا اور ہر لاٹھی لاٹھی تھی اور ہر رسی رسی تھی) تو اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی کوئی بات ہی نہیں ہے کیونکہ ہر بڑا جادو چھوٹے جادو کے اثر کو ختم کر دیتا ہے اس سے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ نہیں بلکہ ان کا جادوگر ہونا ثابت ہو جائیگا۔ یہی فرق معجزہ اور جادو میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو جادوگر معجزہ ہی یقین کر کے ایمان لائے وہ صاحب فن تھے وہ جان گئے کہ فرعون کے اعلان کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر جادوگر ہوئے ہوتے اور ان کی لاٹھی والا سانپ جادوگروں ہی کی طرح کا ایک جادو ہوا ہوتا تو کم از کم لاٹھیاں اور رسیاں تو باقی رہ جاتیں۔ یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہوا جادوگروں کے جادو کا اثر تو ختم ہو ہی گیا ان کی لاٹھیاں اور رسیاں بھی سرے ہی سے غائب ہو گئیں۔ یقیناً یہ چیز جادو سے بڑھ کر کوئی دوسری طاقت ہے اسی وجہ سے انہوں نے صاف اعلان کر دیا

آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ	ہم رب العالمین پر ایمان لائے
رَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ	جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے

مفسرین اسلام نے یہی بیان کیا ہے

فَقَالَ السَّحَرَةُ لَوْ كَانَ هٰذَا السِّحْرُ لَبَقِيَتْ حِبَالُنَا وَعِصِيُّنَا [1]	جادوگروں نے کہا اگر یہ جادو ہوتا تو کم از کم ہماری رسیاں اور لاٹھی تو باقی رہ جاتی۔

[1] تفسیر بیضاوی ص ۱۶۵ ج ۲۔ روح المعانی ص ۲۹ ج ۹

تمام حضرات مفسرین، صحابہ، تابعین، اور تمام اہل لغت نے اس جگہ یہی تفسیر کی ہے۔

سیاسی تسلّط

جادوگروں کے ایمان لانے کا واقعہ سورۂ شعراء اور سورۂ طٰہٰ میں بھی مذکور ہے جادوگروں نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ یہ کہدیتے

آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ — ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے

بلکہ "رب موسیٰ و ہارون" کہا۔ اور سورۂ طٰہٰ میں ہے "ربّ ہارون و موسیٰ" اسی سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے فرعون کی ربوبیت کا انکار کر دیا تھا اور اس وہم کو بھی دور کر دیا کہ جو فرعون کا دعویٰ تھا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ اور اسی وجہ سے جادوگروں نے اپنے جادو کی ابتداء فرعون کے نام سے کی تھی

وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ — قسم ہے عزت فرعون کی ہم ہی
اِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُوْنَ — غالب ہوں گے

اور بعض روایات میں تو یہ بھی مذکور ہے کہ جب جادوگروں نے رب العالمین کہا تو فرعون نے سوال کیا، اس سے تمہاری مراد کیا ہے انہوں نے کہا رب موسیٰ اور ہارون مراد ہے اس میں صاف نکتہ یہ ہے کہ فرعون اپنی ربوبیت کی حفاظت کے چکر میں تھا سلطنت کی حفاظت کے چکر میں نہیں تھا قرآن پاک واضح طور پر فرعون کی چالبازی کو ظاہر کر رہا ہے کہ اس نے اپنی ربوبیت کو بچانے کے لئے ایک نفسیاتی اور جذباتی نعرہ دیا کہ حضرت موسیٰ اور ہارون اپنے جادو کے زور سے باشندگانِ مصر کو مصر سے بیدخل کر کے اپنا اقتدار جمانا چاہتے ہیں اسی وجہ سے فرعون نے پہلے ہی دن کے معجزہ پر یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا تاکہ اس کی خدائی بھی باقی رہے اور جذبات میں آکر لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کو اپنے جادوگر لیکر نکل کھڑے

ہوں تاکہ فرعون کی پردہ پوشی بھی رہے اور کام بھی بن جائے ورنہ فرعون کو یقین ہو چکا تھا کہ اب ہماری خدائی کی خیر نہیں ہے

رہا سلطنت کی حفاظت کا معاملہ تو فرعون تو فرعون معمولی سی حکومت بھی چند کمزور آدمیوں کے مقابلہ میں ہتھیار نہیں ڈال سکتی فرعون ایک ہی چال سے دو کام لے رہا تھا اپنی خدائی کی حفاظت، اور اپنی خدائی کی کمزوری سے لوگوں کی توجہ ہٹانا۔ اسی وجہ سے فرعون نے آخر میں سوال کیا تھا کہ کہیں میں ہی تو مراد نہیں ہوں، میں نے ہی موسیٰ کو جتایا ہے میں ہی موسیٰ اور تمہارا رب ہوں قرآن پاک کو ملاحظہ فرمائیے!

۱۔ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ (شعراء)	یہ دونوں جادو کے زور سے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالنا چاہتے ہیں۔
۲۔ قَالُوا إِنَّ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَنْ يُخْرِجَاكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ (طٰہٰ)	بولے یہ دونوں جادوگر تہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور سے اور تمہارے افضل دین کو مٹانا چاہتے ہیں۔
۳۔ هَٰذَا لَمَكْرٌ مَكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ	یہ تم لوگوں کی چالبازی ہے جو تم نے اختیار کی ہے تاکہ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دو اب معلوم ہو جائیگا۔

یعنی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور پیغام رسالت کو ملک گیری اور حصول اقتدار کی مہم قرار دیکر اپنی خدائی کو بلا عیب کے بچانا چاہا ورنہ ظاہری طاقت کے اعتبار سے دو آدمیوں کی حکومت کے آگے حیثیت

ہی کیا ہے

یہ بھی یاد رہنا چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور کوشش حصول اقتدار ہی کے لیے نہیں بلکہ اصلاح خلق اور قیام توحید الٰہی، ابطال شرک و بت پرستی کے لئے ہوتی ہے قیام حکومت کسی پیغمبر بلکہ نائب پیغمبر کے مقاصد اصلی میں داخل نہیں رہا ہے۔ بلکہ ان نفوس قدسیہ نے حکومت کو ہمیشہ عمل صالح کا نتیجہ اور انعام خداوندی سمجھا ہے۔ جو نیک اعمال پر ملتا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

۱۔ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ	جو ایمان لائے اور عمل صالحہ کیے ان کو خلافت فی الارض عطا کردی جائے گی جیسا کہ ان سے پہلوں کو عطا ہوئی ہے
۲۔ اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا مِنْ عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ	بیشک زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہونگے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ خلافت اور وراثت فی الارض اور اقتدار ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجہ میں ملتا ہے پہلے صلاح اور تقوی آئیگا اس کے بعد خلافت آئے گی اور قرآن پاک میں لفظ وراثت یہی بول رہا ہے کیونکہ وراثت وہی ہے جو بلا کسب کے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نبی نے سب سے اول تمکن اور اقتدار کی کوشش نہیں کی بلکہ ایمان اور اعمال کے لئے کوشش کی لیکن مودودی صاحب کی سنیئے! وہ کیا فرماتے ہیں:۔

اگر حقیقت میں وہ حضرت موسیٰ ؑ کو جادوگر سمجھتے تو ہرگز ان سے سیاسی انقلاب کا اندیشہ نہ کرتے کیونکہ جادو کے بل بوتے پر دنیا میں

یہ آخری سطریں ہیں لیکن ان چند سطروں سے اوپر اس کی تفصیل ہے
حضرت موسیٰ ع کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور
اس کے اعیان سلطنت کے سامنے سیاسی و معاشی و تمدنی انقلاب
کا خطرہ نمودار ہو گیا۔ (ایضاً)

جناب مودودی صاحب نے اکثر مقام پر انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کو یہی رنگ دیدیا ہے (جیسا کہ ہم گذشتہ سطور میں سیاسی ربوبیت کے تحت ذکر کر چکے ہیں (تفصیل آئندہ بھی آئے گی) انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائبین کی دعوت تبلیغ کو یہ رنگ دینا ملک گیری کے مترادف ہو گا اور مودودی صاحب کا حال یہ ہے کہ اس بات پر محل ہو یا نہ ہو وہ زبردستی اسی فلسفہ کو سامنے لاتے ہیں چنانچہ سورۂ اعراف کی مندرجہ ذیل آیات کے تحت بیان کرتے ہیں

قَالَ عَذَابِىٓ أُصِيبُ بِهِۦ مَنْ أَشَآءُ ۖ وَرَحْمَتِى وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱلَّذِينَ هُم بِـَٔايَٰتِنَا يُؤْمِنُونَ	فرمایا سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے زکوٰۃ دینگے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے ع ۲

ان آیات کی تشریح فائدہ ۱۱۲ میں بیان کرتے ہوئے بلا جوڑ اور ربط تصرف ملاحظہ فرمایئے:-

تم سے کہا گیا تھا کہ رحمت الٰہی سے حصہ پانے کے لئے زکوٰۃ بھی ایک شرط ہے تو آج کسی انفاق مال پر اس وقت تک زکوٰۃ کی تعریف صادق نہیں آسکتی جب تک اقامت دین حق کی اس جدوجہد کا

ساتھ نہ دیا جائے جو اس پیغمبر کی قیادت میں ہو رہا ہے لہذا
جب تک اس راہ میں مال صرف نہ کرو گے زکوٰۃ کی بنیاد ہی استوار
نہ ہوگی [1]

اس جگہ غور فرمائیے! آیات اور ان کا ترجمہ کیا ہے تشریح کیا
ہے۔ اس ادبیت نوازی پر کوئی تنقید کرے تو کیا کرے؟!

ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ قیام حکومت انبیاء کے بنیادی مقاصد
میں نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو بادشاہِ وقت
بھی ہونا چاہئے تھا (تفصیل آئے گی) اس کے باوجود ہم مسئلہ قیام حکومت
سے چڑاتے نہیں ہیں اور نہ یہ ہماری چڑنے کی بات ہے۔ قرآن پاک
کہتا ہے کہ خلافت اور حکومت ایمان اور عمل صالحہ سے پیدا ہوتی ہے اس
کے حصول کے لئے زیادہ بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے اس بارے میں ہماری
تحقیق آئندہ آئے گی۔

سجدۂ تلاوت سورۂ اعراف کے آخر میں چونکہ سجدۂ تلاوت ہے
اس جگہ مولانا مودودی صاحب نے فائدہ ۱۵۷
ص ۱۱۵ ج ۲ میں تحریر فرمایا ہے:-

قرآن مجید میں ایسے چودہ مقامات ہیں جہاں آیات سجدہ آئی
ہیں ان آیات پر سجدہ کا مشروع ہونا تو متفق علیہ ہے مگر اس
کے وجوب میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ رح سجدۂ تلاوت کو واجب
کہتے ہیں اور دوسرے علماء نے اس کو سنت قرار دیا ہے۔ نبی
صلے اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک بڑے مجمع میں قرآن پڑھتے
اور اس میں جب آیت سجدہ آتی تو آپ خود بھی سجدہ میں گر جاتے
اور جو شخص جہاں ہوتا وہیں سجدہ ریز ہو جاتا حتیٰ کہ کسی کو سجدہ

[1] ص ۶ ج ۲ فائدہ ۱۱۲

کرنے کے لئے جگہ نہ ملتی تو وہ اپنے آگے والے شخص کی پیٹھ پر سر رکھ دیتا یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے موقعہ پر قرآن پڑھا اور اس میں جب آیت سجدہ آئی تو جو لوگ زمین پر کھڑے تھے انہوں نے زمین پر سجدہ کیا اور جو لوگ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار تھے وہ اپنی سواریوں پر ہی جھک گئے۔ کبھی آپ نے دوران خطبہ میں آیت سجدہ پڑھی تو منبر سے اتر کر سجدہ کیا ہے اور پھر اوپر جا کر خطبہ شروع کر دیا۔

اس سجدہ کے لئے جمہور انہی شرائط کے قائل ہیں جو نماز کی شرطیں ہیں یعنی باوضو ہونا قبلہ رخ ہونا اور نماز کی طرح سجدہ میں زمین پر سر رکھنا لیکن جتنی احادیث سجود تلاوت کے باب میں ہم کو ملی ہیں ان میں کہیں ان شرطوں کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آیت سجدہ سنکر جو شخص جہاں جس حال میں ہو جھک جائے خواہ باوضو ہو یا نہ ہو خواہ استقبال قبلہ ممکن ہو یا نہ ہو خواہ زمین پر سر رکھنے کا موقعہ ہو یا نہ ہو سلف میں بھی ہم کو ایسی شخصیتیں ملتی ہیں جن کا عمل اس طریقہ پر تھا چنانچہ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر رض کے متعلق لکھا ہے کہ وہ وضو کے بغیر سجدہ تلاوت کرتے تھے اور ابو عبدالرحمٰن السلمی کے متعلق فتح الباری میں لکھا ہے وہ راستہ چلتے ہوئے قرآن مجید پڑھتے جاتے تھے اور اگر کہیں آیت سجدہ آجاتی تو بس سر جھکا لیتے تھے خواہ باوضو ہوں یا نہ ہوں اور خواہ قبلہ رخ بھی ہوں یا نہ ہوں ان وجوہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اگرچہ زیادہ مبنی بر احتیاط مسلک جمہور ہی کا ہے لیکن اگر کوئی شخص مسلک جمہور کے خلاف عمل

کرے تو اسے ملامت بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ جمہور کی تائید
میں کوئی سنت ثابتہ موجود نہیں ہے الخ صفحہ ۱۱۶ ج ۲

اس بارے میں چند فقرے ملاحظہ فرمائیے!
ا۔ مسلک جمہور کے حق میں جب کوئی سنت ثابتہ نہیں ہے تو وہ بدعت ہے اور واہی اور لغو ہے مسلک حق وہی ہے جس کا مبنی سنت ثابتہ پر ہو۔
ب۔ ایسا مسلک جس کی تائید میں سنت ثابتہ نہ ہو اس کے بارے میں کہنا کہ "اگرچہ زیادہ مبنی بر احتیاط مسلک جمہور ہی کا ہے" ایک فضول بات ہے جس کی تائید میں کوئی سنت نہ ہو وہ بدعت ہے اور بدعت کو کسی بھی احتیاط کی بنا پر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔
ج۔ جتنی احادیث سجود کے بارے میں ہیں اگر مودودی صاحب کیلئے ان میں کوئی دلیل نہیں ملی تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ عدم ذکر سے عدم وجود بھی ہے بہت مرتبہ اور بہت مثالیں ایسی ہیں کہ ان کا ذکر نہیں لیکن وہ موجود ہیں۔
د۔ ایسا مسلک جس میں جمہور تو ایک طرف ہوں اور آنجناب یا بعض افراد ایک طرف ہوں اس کے اثبات میں کچھ تو دلیلیں ہونا ضروری ہیں یا کم از کم حوالے ہی دو چار ہوں۔ یہ بھی کیا عجیب تماشہ ہے کہ بائیبل کی کوئی عبارت بلا باب، آیت نمبر وغیرہ کے نہ چھوڑی جائے اور اسلامیات کا جب ذکر ہو تو بلا حوالہ ہی ٹال دیا جائے عہ

مودودی صاحب نے بخاری شریف کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت ابن عمر رضہ بلا وضو کے سجدہ تلاوت کر لیا کرتے تھے، تو یہ اثر امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے بخاری شریف کی ایک دوسری

عہ مودودی صاحب کتابوں کا حوالہ اپنی تفسیر میں بہت ہی کم دیتے ہیں

روایت جس کو امام اسمٰعیلی نے روایت کیا ہے اس سے ثابت ہے کہ وضو کے ساتھ سجدہ کیا کرتے تھے اس کے علاوہ خود حضرت ابن عمر رضؓ کا فتوے اس کے خلاف ہے جسکو بیہقی نے صحیح سند سے اور ثقات سے روایت کیا ہے

لا یسجد الرجل الا وھو طاھر[له] — کوئی آدمی بلا وضو کے سجدہ نہ کرے۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمر رضؓ کا یہ فتویٰ اپنی طرف سے ایجاد نہیں ہے بلکہ کسی صحابی نے کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا جس کو انہوں نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو یا کرتے نہ دیکھا ہو اسی میں یہی دلیل ہے کہ حضرت ابن عمر رضؓ کا عمل کسی عذر کی بنا پر ہوگا اسی وجہ سے لوگوں کے شک کو دور کرنے کے لئے انہوں نے فرمایا کہ کوئی بلا وضو سجدہ نہ کرے۔ یہی معاملہ امام شعبی ابو عبدالرحمٰن السلمی کا ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضؓ کے عمل کو صرف انہوں نے ہی اختیار کیا تھا اس میں خود دلیل موجود ہے کہ جس عذر کی وجہ سے حضرت ابن عمر رضؓ نے وہ عمل اختیار کیا تھا غالباً وہی عذر شعبی کو ہوگا ورنہ عمومی حالات میں سب کو وہی کرنا چاہیئے تھا کیا یہ بات محل نظر نہیں ہے کہ حضرات صحابہ رضؓ اور تابعین جن کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے ان میں سے کوئی بھی ان دو کی اتباع کرنے والا نہیں ہے اور ان پر طعن یا اعتراض نہ کرنا خود پکار رہا ہے کہ ان دونوں حضرات کا مسلک وہی تھا جو بیان ہو چکا ہے لیکن عذر کی وجہ سے عمل یہ تھا۔

یہ تو آج کل بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی مفتی یا عالم کو کوئی عذر شرعی ہو (جس کی وجہ سے وہ بلا وضو نماز پڑھ لے کیونکہ معذور شرعی کا عذرِ شرعی کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا) اور کوئی دیکھنے والا کہدے کہ بلا وضو کے نماز جائز ہے

[له] فتح الباری ص۴۵۹ ج۲ ... المدونۃ الکبریٰ صفحہ ۳۸ ج ۲

تو ہر سمجھدار بآسانی سمجھ جائیگا کہ اس مفتی کا یہ عمل کسی عذر کی وجہ سے ہے لیکن مسلک وہی ہے جو اس کا فتویٰ ہے رات دن اس کی سینکڑوں مثالیں سامنے آتی ہیں۔

رہا سنت ثابتہ کا معاملہ پوری ملت میں سے صرف مذکورہ دو حضرات کا عمل وہ ہے جو ذکر کیا ہے اور فتویٰ وہ ہے جو بیان ہو چکا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر خیر القرون تک کسی فرد سے بھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہے تو کیا یہ سنت ثابتہ کے لیئے کافی نہیں ہے؟

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ — میری امت گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی

کیا پوری ملت کا اجماع سنت ثابتہ کے خلاف ہے ہمیں شریعت میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں ملا کہ ملت نے اس پر اجماع کیا ہو اور مشکوٰۃ نبوت یا وحی الٰہی سے اس کو روشنی حاصل نہ ہو اگر مودودی صاحب کو کوئی ایسی چیز کھٹکتی ہے تو وہ خود یا ان کا کوئی عقیدت مند اسکو بتلائے مودودی صاحب نے تو بتلا دیا اور اس کی حقیقت بھی سامنے ہے اب ان کی مقلد جماعت اسلامی کے بارے میں ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ بلا وضو سجدے نہ کر رہے ہوں گے۔

الانفال

غزوۂ بدر | جناب مودودی صاحب نے سورۂ انفال کے دیباچہ کے ایک حاشیہ میں لکھا ہے

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ بدر کے بیان میں تاریخ اور سیرت کے مصنفین نے صرف ان روایات پر اعتماد کر لیا ہے جو حدیث اور مغازی کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں ان روایات کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے[1] اور قابل اعتماد نہیں ہے محض ایمان ہی کی بنا پر ہم جنگ بدر کے متعلق قرآن کا بیان سب سے زیادہ معتبر سمجھنے پر مجبور نہیں ہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی آج اس جنگ کے متعلق اگر کوئی معتبر ترین بیان موجود ہے تو وہ یہی سورۂ انفال ہے ص ۱۲۶ ج ۲

اس باب میں مودودی صاحب نے علامہ شبلی کا پس خوردہ استعمال کیا لیکن اس کو بھی وہ سلیقہ سے استعمال نہ کر سکے بلکہ ضرورت سے زیادہ الفاظ استعمال کر ڈالے علامہ شبلی نے تو نہایت لطیف اور مہذب پیرائے میں اختلاف کیا ہے فرماتے ہیں :-

واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لئے آسمان کے نیچے اس (قرآن میں سورۂ انفال) سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ نہیں ہے[2]

---

[1] قرآن پاک کے خلاف نہیں بلکہ آیات کی تاویل جس مفروضہ کی بنیاد پر کی ہے اس کے خلاف ہے

[2] سیرت النبی ج ۱ ص ۳۲۲ مودودی صاحب کے تبصرہ اور شبلی کے تبصرہ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے بات صرف ایک ہی ہے لیکن مودودی صاحب کی عبارت تہذیب کے دائرہ سے باہر ہے! غور فرمایئے کیا ہم محض ایمان کی بنیاد پر قرآن پاک کی تصدیق کے مکلف ہیں یا نہیں۔

جہاں تک اپنے دعوی کو قرآن پاک سے ثابت کرنا اور دوسرے شواہد اور دلائل اور قرائن کو رد کرنے کا تعلق ہے مودودی صاحب کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ دلائل علامہ شبلی نے بیان کر دئے ہیں ہم ان دلائل اور شواہد کا حوالہ دینگے اور صرف قرآن پاک ہی کی روشنی میں ان ہر دو حضرات کے مفروضات کو ان ہی کے زبان و قلم سے رد کرینگے وباللہ التوفیق

غزوہ بدر کے سلسلہ میں یہ بات معلوم ہونا ضروری ہے کہ ارباب سیر و مغازی و محدثین یہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے قریش کے اس قافلہ کے تعاقب میں نکلے تھے جو ملک شام سے جنگی سامان لیکر مکہ معظمہ کو آرہا تھا۔ اور علامہ شبلی اور ان کا پس خوردہ استعمال کرنے والے یہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے جنگ بدر کے لئے مشرکین مکہ سے جنگ کرنے کے لئے نکلے تھے۔ اس کی وجہ اختلاف کیا ہے؟ اس کی تمہید و بیان میں بہت تفصیل ہو جائے گی مقصود صرف فریقین کے دلائل کا تعاقب اور اپنی بات کا اثبات ہے۔

۱۔ كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ بِٱلْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ لَكَٰرِهُونَ يُجَٰدِلُونَكَ فِى ٱلْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى ٱلْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ	جس طرح نکالا آپ کو آپ کے ربنے آپ کے گھر (مدینہ) سے حق کے ساتھ اور بیشک ایک فریق مومنین کا اس کو برا جان رہا تھا جھگڑتے تھے آپ سے حق کے بارے میں بعد ظاہر ہونے کے گویا وہ ہانکے جا رہے ہیں آنکھوں دیکھتے موت کی طرف۔

۲۔ وَإِذْ يَعِدُكُمُ ٱللَّهُ إِحْدَى — اور جب اللہ تعالے نے تم سے

الطَّائِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ	دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کیا کہ وہ تمہارے لئے ہے اور تم چاہتے تھے کہ بے خرخشہ والا ہو (یعنی قافلہ)
۳۔ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا	اور یاد کرو جب تم عدوۃ الدنیا پر تھے اور کفار عدوۃ القصوی پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے کیطرف تھا اگر تم آپس میں وعدے کے مطابق آتے تو اختلاف ہوجاتا اور لیکن اللہ تعالےٰ ہونے والے کام کو کرنے والا تھا۔

ان آیات اور دیگر آیات سے ہمیں ثابت کرنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قافلہ کے تعاقب ہی کے لئے نکلے تھے نہ کہ مشرکین کے ساتھ شروع ہی سے بارادہ جنگ۔

۱۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکلنے سے پہلے دو جاسوسوں کو قافلہ کی خبر لانے کے لئے بھیجا تھا وہ ارض حوار تک گئے اور وہاں سے واپس ہوگئے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کردیں۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جاسوسوں نے ذالمروہ کے قریب پہونچ کر اطلاع دی کہ ابوسفیان کا قافلہ آتا ہے اور یہ جگہ مدینہ منورہ سے تقریبًا آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔

۳۔ مقام زرقا پر پہونچ کر (جو ینبوع کے قریب ہے) ابوسفیان نے مشرکین مکہ کی اطلاع کے لئے قاصد بھیجا تھا۔

۴۔ عدوۃ الدنیا اور عدوۃ القصویٰ اور جبل اسفل کے بارے میں اہل لغت

اور جغرافیہ نے بیان کیا ہے کہ :

بدر کے اطراف وجوانب میں جو پہاڑ ہیں ان کے مختلف حصے ہیں اور وہ مختلف ناموں سے موسوم ہیں ان میں سے جو دو سفید پہاڑیاں دور سے ریت کے دو تودوں کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں اب بھی ان میں سے جو پہاڑ مدینہ منورہ کی جانب ہے اس کا نام العدوۃ الدنیا ہے اور دوسرا جو مکہ مکرمہ کی سمت ہے العدوۃ القصویٰ ہے اور جو بہت اونچا سا پہاڑ دونوں کے بیچ ہے وہ آج کل جبل اسفل کہلاتا ہے [1]

اس جغرافیہ کو اس طرح سمجھنا چاہیئے۔

[1] لغات القرآن صفحہ ۲۵۵ ج ۴
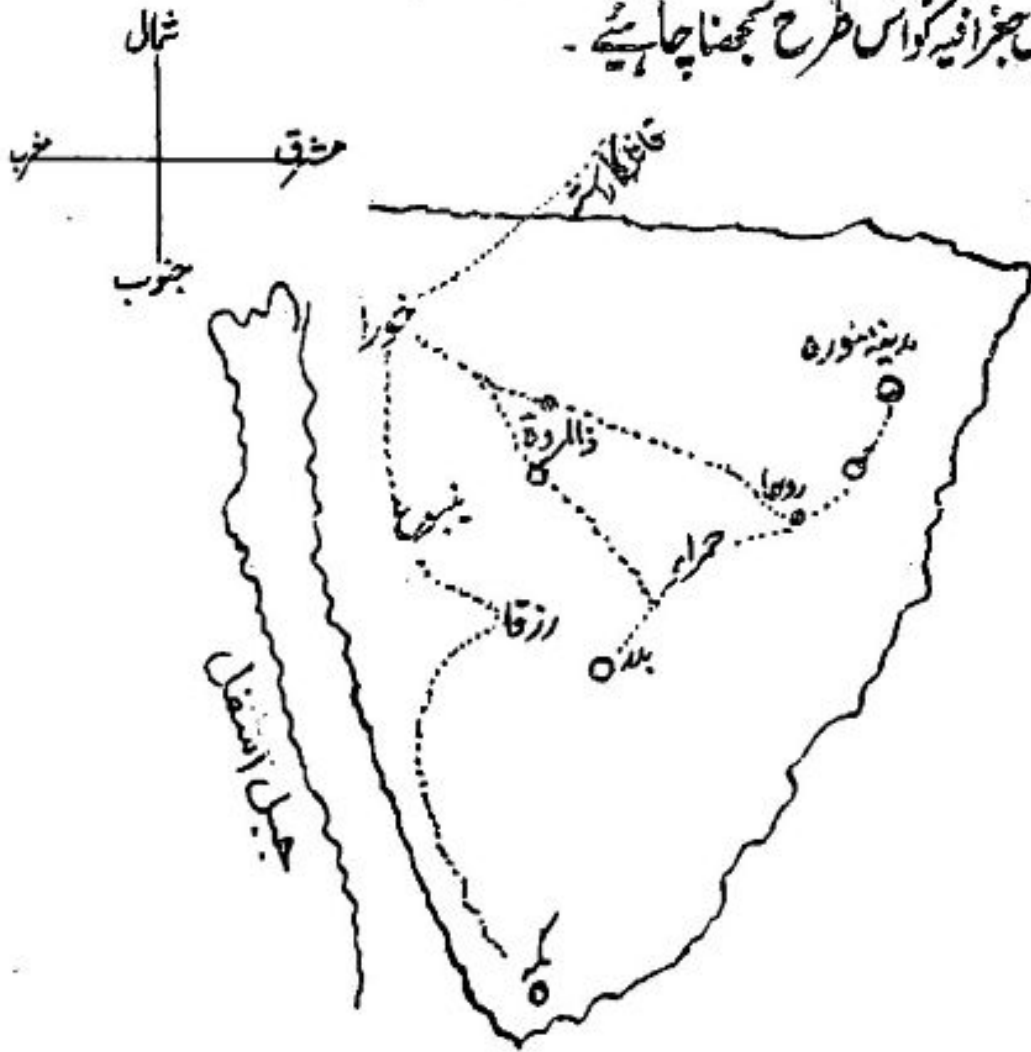
اب معلوم ہونا چاہیئے کہ بدر مدینہ منورہ سے اسی میل کے فاصلہ پر ہے
اور مقام خورار دس دن کی راہ پر ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے قاصد گئے مقام روحا پر پہونچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی
لشکر سے بچوں کو علیحدہ کر دیا تھا ان بچوں میں حضرت عبداللہ بن عمر
اسامہ بن زید، رافع بن خدیج، براء بن عازب، اُسید بن حضیر، زید
بن ارقم، زید بن ثابت، عمیر بن ابی وقاص کو علیحدہ کر دیا اور ابولبابہ
کو مدینہ منورہ پر خلیفہ مقرر کیا۔ اگر پہلے ہی سے جنگ کے لئے نکلنا تھا تو
پھر ان بچوں کو شروع میں کیوں ساتھ لیا جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے جتنے غزوات کئے ہیں سب میں مدینہ سے نکلنے سے پہلے
ہی اپنا خلیفہ مقرر فرما دیا کرتے تھے ایسا نہیں ہے کہ مدینہ منورہ سے باہر
آنے کے بعد مقرر فرما کر بھیجے ہوں یہ ایسا قرینہ ہے جو صاف بول رہا ہے
کہ آپ مدینہ منورہ سے بارادہ جنگ نہیں نکلے تھے

قرآن شریف صاف کہہ رہا ہے کہ جس وقت مسلمان العدوۃ الدنیا
پر تھے جسکو عدوہ شامیہ بھی کہا جاتا ہے اس وقت مشرکین العدوۃ القصویٰ
پر تھے اور قافلہ جبل اسفل کی طرف سے ہو کر صاف بچ گیا تھا۔ اور مشرکین اور
مسلمانوں دونوں کو اس کا بچ کر نکل جانا معلوم ہو چکا تھا اسی جگہ مشرکین
میں اختلاف ہوا تھا کہ اب جنگ کرنا بیکار ہے اور قافلے کے چلے جانے
کی خبر سے مسلمانوں میں اختلاف ہوا تھا قرآن پاک نے صاف کہہ دیا ہے

اگر تم میں سے آپس میں مقررہ وعدہ پر یہ واقعہ پیش آیا
ہوتا تو وعدہ سے ہٹنا ممکن تھا لیکن اللہ تعالےٰ ہونے والی
بات کو کرنا چاہتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ کا پہلے سے کوئی ارادہ نہ تھا جنگ کا ارادہ
تو مدینہ منورہ سے باہر آنے پر کیا جب قاصدوں نے خبر دی کہ قافلہ جا چکا ہے

اور مشرکین لشکر لیکر آرہے ہیں اسی کے بارے میں قرآن شریف نے بیان کیا ہے۔

گویا موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔

علامہ شبلی نے مذکورہ آیت میں (وَاِنَّ فَرِیۡقًا) میں واؤ کو حالیہ قرار دیا ہے اور مودودی صاحب کو اس استدلال کی ہوا بھی نہیں لگی ہے لیکن قاضی بیضاوی نے کہا ہے کہ واؤ حالیہ بھی ہو سکتی ہے اور واؤ استیناف کے لئے بھی اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے فرمایا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ واؤ استیناف کے لئے ہے یعنی یہاں سے جدید جملہ شروع ہوا ہے، اس ترکیب کے اعتبار سے علامہ شبلی اور مودودی صاحب کی دونوں کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے کہ تم سے دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کیا تھا اور تم بلا خرخشہ والی چاہتے ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ وعدہ واقعہ مذکورہ سے پہلے ہی (خواب میں کیا گیا تھا) اگر آپ جنگ کے لئے ہی شروع سے نکلتے اور ابو سفیان کے لئے نہ نکلتے تو اس ارشاد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دو چیزیں سامنے تھیں ایک ہاتھ سے نکل گئی تھی اور ایک پر کامیابی ہونے والی تھی مسلمانوں کا ملال نکلی ہوئی چیز پر تھا حالانکہ ابھی ایک کامیابی باقی تھی اور وہی اہل تھی۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو جغرافیہ اور عبارت قرآن کو سامنے رکھنے سے ثابت ہیں مودودی صاحب کی یہ بات اپنی طرف سے ایجاد ہے کہ مسلمانوں کا ابتدائی رُخ جنوب مشرق کی طرف کو تھا حالانکہ سند کے ساتھ جو چیز ثابت ہے مسلمانوں کا ابتدائی رخ جانب یمین یعنی جنوب مغرب کو تھا اس سے بھی یہ ثابت ہے کہ آپ مدینہ منورہ سے اولاً قافلہ کے تعاقب ہی میں نکلے

تھے نہ کہ بارادہ جنگ

فرشتوں کی جنگ

اِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ

اور وہ وقت جبکہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کررہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو۔ میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں پس تم ان کی گردنوں پر ضرب دو اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔

ان آیات میں فَاضْرِبُوا امر کا صیغہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ مشرکین کو قتل کریں اور مسلمانوں کو جمائے رکھیں چنانچہ صحیح اسناد سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کے وار سے پہلے ہی کافر مقتول ہوجاتا۔ اس کی تاویل میں مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

جو اصولی باتیں ہم کو قرآن کے ذریعہ معلوم ہوئی ہیں ان کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ فرشتوں سے قتال میں یہ کام نہیں لیا گیا ہوگا کہ وہ خود حرب و ضرب کا کام کریں بلکہ شاید اس کی صورت یہ ہوگی کہ کفار پر جو ضرب مسلمان لگائیں وہ فرشتوں کی مدد سے ٹھیک بیٹھے اور کاری لگے واللہ اعلم فائدہ ص ۱۴۳ ج ۱۰

اس جگہ مودودی صاحب کو اصولی طور پر قرآن پاک سے یہ ثابت نہیں ہے کہ فرشتوں نے اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے دشمنوں یعنی کافروں کو قتل کیا تھا جبکہ صحیح سند سے فرشتوں کے متعلق یہ ہے جو ہم نے اوپر ذکر کردیا ہے البتہ مودودی صاحب کی سمجھ میں اصولی طور پر قرآن پاک کے ذریعہ یہ ثابت ہوگیا کہ فرشتے جادو سکھایا کرتے تھے

(ملاحظہ فرمائیے گذشتہ سطور میں ہاروت وماروت کا قصہ) دونوں باتیں انتہائی لغو اور بیہودہ کہی ہیں بلاشک وشبہ مودودی صاحب کو قرآن فہمی تو کیا زبان عرب کے سمجھنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ اس جگہ چند روایات کا مطالعہ فرمائیے

۱۔ امام مسلم اور ابن مردویہ نے ابن عباس رض سے روایت کیا ہے کہ بدر کے دن ایک مسلمان نے ایک کافر کا تعاقب کیا اس نے دیکھا کہ سامنے سے کوڑے کی آواز آئی اور فوراً وہ مشرک گر گیا۔ دیکھا تو وہ مشرک کہ اس کے چہرے پر کوڑے کا نشان تھا مرا ہوا پڑا تھا ایک انصاری نے جب اسکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا یہ سچ ہے اور تیسرے آسمان کی مدد ہے۔

۲۔ سہل بن حنیف کہتے ہیں کہ بدر کے دن ہم نے دیکھا کہ جب ہم کسی کافر پر وار کرنا چاہتے تو ہماری ضرب سے پہلے ہی اس کی گردن کٹ کر علیحدہ ہو جاتی اسکو حاکم نے روایت کیا ہے اور بیہقی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے

۳۔ بیہقی نے ربیع بن انس سے روایت کیا ہے کہ بدر کے دن لوگ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ کس نے کس کو قتل کیا ہے چنانچہ جو فرشتوں کے مقتول ہوتے ان پر دوزخ کی آگ سے جلنے کی علامت ہوتی تھی

۴۔ سعد نے حویطب بن عبدالعزی سے روایت کیا ہے کہ میں جنگ بدر میں شریک تھا میں نے فرشتوں کو آسمان اور زمین کے درمیان کافروں کو قتل کرتے دیکھا ہے۔

۵۔ بیہقی نے ابوبردہ رض سے روایت کیا ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تین سر لیکر حاضر ہوا اور عرض کیا ان میں سے دو کو میں نے قتل کیا ہے تیسرے کے بارے میں میں نے اتنا دیکھا کہ ایک سفید عبا آدمی میں بنے دیکھا اس نے اس پر وار کیا اور میں نے اس کا سر اٹھا لیا

آپ نے فرمایا یہ فلاں فرشتہ تھا اس روایت کو بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے
یہ روایات اور ان کے علاوہ متعدد روایات ہیں جن سے قرآنی عبارت
کی تصدیق ہوتی ہے، معلوم نہیں کہ مودودی صاحب کو یہ روایات نظر آئیں
یا نہیں اگر آئیں تو انہوں نے ان آیات سے قرآن پاک کا کون سا اصول
ٹوٹتے دیکھا جو چھوڑ دیا

حکم قتال میں تخفیف

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَاِنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ

اے نبی! مومنین کو جنگ کے لئے ابھارو اگر تم میں بیس ثابت قدم ہونگے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سو ہونگے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائینگے اسلئے کہ وہ نافہم قوم ہے ۔ اب تخفیف کردی اللہ نے تم پر سے اور جان لیا تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سو ثابت قدم رہیں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر ایک ہزار ہونگے تو دو ہزار پر غالب آجائیں گے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

سورۂ انفال کی ان آیات سے پہلے کی آیات، کو بھی ذہن میں رکھنا
چاہیئے۔

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا زَحۡفًا فَلَا تُوَلُّوۡهُمُ الۡاَدۡبَارَ وَ مَنۡ یُّوَلِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاۡوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ

ایمان والو! جب تم کافروں سے بھڑو تو ان سے پشت دیکر نہ بھاگو جس نے اس وقت ان سے پشت دکھائی الا یہ کہ جنگی چال کے لئے یا اپنی فوج سے جا ملنے کیلئے تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

ان آیات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قتال کی فرضیت ہونے کے بعد یہ پہلا حکم تھا کہ لشکر کفار سے کسی طرح بھی پشت دیکھ بھاگنا حرام تھا اس وقت صرف دو صورتیں تھیں یا تو کافروں کو ختم کر دیا جائے یا خود شہید ہو جائیں جنگ سے بھاگنے کے لئے کوئی جواز نہیں تھا ان آیات کے بعد اوپر والی آیات ہیں اسوقت مسلمانوں کے لئے حکم تھا کہ اپنے سے دس گنا کافروں کا مقابلہ کریں اور پشت نہ دکھائیں تو وہ اللہ کے حکم سے اپنے سے دس گنے کافروں پر غالب آجائینگے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے سب سے بڑا گناہ لشکر کفار سے پشت دیکر بھاگنے کو قرار دیا ہے اور یہی چیز قرآن شریف سے بھی ثابت ہے لہ

شروع کی آیات کے دوسرے جزو سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ حکم شروع میں تھا بعد میں اس حکم میں تخفیف کر دی گئی چنانچہ احادیث سے ثابت ہے کہ امام بخاری رحؒ نے عبداللہ بن مبارک کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے:

اللہ تعالےٰ نے صحابہ رضؓ پر فرض کر دیا تھا کہ وہ اگر بیس ہوں تو

لہ تف[illegible]

دو سو کے مقابلہ سے نہ بھاگیں۔ اس کے بعد حکم میں تخفیف کر دی گئی لہٰذا اب سو مسلمان دو سو کافروں کے مقابلہ سے نہ بھاگیں[1]

یعنی اب قیامت تک کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر مسلمانوں کی تعداد سے کافروں کی تعداد دو چند سے زیادہ ہو اور اس سے مسلمانوں کے پیر اکھڑ جائیں تو وہ گنہگار نہیں ہیں جبکہ پہلے یہ چیز حرام تھی[2] قرآن پاک کی ان آیات کی شان نزول کے بارے میں بھی مذکور ہے امام بخاری اور ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ جب دس گنی تعداد سے مقابلہ کا حکم ہوا تو مسلمانوں کے لئے یہ چیز بھاری معلوم ہوئی لیکن اس کے باوجود ثابت نہیں کہ تا حکم تخفیف حضرات صحابہ رض میں سے کسی نے جنگ میں پشت دکھائی ہو اگرچہ معاملہ بہت مشکل تھا اس کے بعد تخفیف کا حکم نازل ہوا[3] قرآن پاک نے اسی کیطرف اشارہ کیا ہے۔

وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا اللہ کو تمہارا ضعف معلوم ہو گیا

آیت میں ضعف فتح کے ساتھ ہے جس سے اسی قلبی ضعف کی طرف اشارہ ہے جس کو شان نزول میں ذکر کیا ہے جسمانی ضعف مراد نہیں ہے[4] یعنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو گیا کہ یہ حکم تمہارے لئے بھاری ہے۔

شریعت میں تخفیف احکام کی بہت مثالیں ہیں مثلاً رمضان شریف کی راتوں میں اپنی عورتوں سے مباشرت کا حکم، قصر صلوٰۃ حالت سفر میں، میراث کے احکام صرف وارثوں کے لئے اگرچہ شروع میں میراث کا حق مواخاۃ کی بنیاد پر بھی تھا یہی حال قتال اور جہاد کے بارے میں ہے شروع میں مسلمان کم تھے اور اہل کفر زیادہ تھے بلکہ غالب عنصر وہی تھے اس حالت میں اللہ ہی چند مسلمانوں کو ہر حال میں کافروں کا مقابلہ کرنا تھا

---

۱ رواہ بخاری ۲ تفسیر ابن کثیر ص۳۲۴ ج ۲ ۳ رواہ بخاری و ابن اسحٰق عن ابن مبارک ۴ تفسیر [illegible] ص۱۹۵ ج ۲

اس لئے اہل کفر کی بڑی سے بڑی تعداد سے بھاگنے کو حرام قرار دیا گیا اگر اس حکم میں شروع میں تخفیف والی رعایت رکھی جاتی تو مسلمان کا نزول پر غالب نہیں آسکتے تھے اور نہ وہ عرب میں اسلامی انقلاب برپا کر سکتے تھے قرآن کی آیت سے یہ تو حقیقت ثابت ہے اور یہی صحیح احادیث کر ثابت ہے اب مودودی صاحب کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے جو تنہا انکی رائے ہے

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے ایک اور دس کی نسبت تھی اور اب چونکہ تم میں کمزوری آگئی ہے اسلئے ایک اور دو کی نسبت قائم کردی گئی بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اصول اور معیاری حیثیت سے تو اہل ایمان اور کفار کے درمیان ایک اور دس ہی کی نسبت ہے لیکن ابھی چونکہ تم لوگوں کی اخلاقی تربیت مکمل نہیں ہوئی ہے اور ابھی تک تمہارا شعور اور تمہاری سمجھ بوجھ کا پیمانہ بلوغ کی حد کو نہیں پہونچا ہے اسلئے سردست بر سبیل تنزل تم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے سے دوگنی طاقت سے ٹکرانے میں تمہیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے۔ فائدہ ص ۱۶۱ ج ۲

اس شخص کو تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے ڈر معلوم نہیں ہوتا۔ خیال فرمائیے جس وقت دس گنے مقابلہ کا حکم تھا اس وقت خطاب سابقین اولین سے تھا ان کے لئے وہ حکم تھا پھر جب یہ حکم بوجھل معلوم ہوا تو تخفیف کا حکم بعد میں دیا گیا اگر تخفیف والا حکم پہلے ہوتا اور دس گنے والا حکم بعد میں دیا جاتا تو یہ بات تھی کہ چونکہ (نعوذ باللہ) اے سابقین اولین! تمہاری اخلاقی تربیت مکمل نہیں ہوئی ہے اور تمہارا شعور بلوغ کی حد کو نہیں پہونچا ہے اور جب تمہاری اخلاقی تربیت ہو جائے گی تو پھر کسی طرح بھی دس گنے مقابلہ سے بھاگنے کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوگی لیکن

قرآن میں حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے وہ حکم بدر تک تھا اور اس میں سب سابقین اولین شریک تھے یہی حضرات وہ ہیں کہ جن کی اخلاقی تربیت کتنی بڑی تھی! ان کی حالتِ شعور کتنی بلند تھی کہ مابعد کے صحابہؓ اس مقام پر نہ پہونچ سکے اور یہ بات قرآن شریف سے ثابت ہے

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ	برابر نہیں تم میں سے جس نے خرچ
مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِکَ	کیا فتح مکہ سے پہلے اور جنگ کی
اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ	ان ہی کا درجہ بہت بلند ہے ان
اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا	لوگوں سے جنہوں نے بعد فتح کے
وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی	خرچ کیا اور جنگ کی اور ہر ایک
(حدید)	فریق کیلئے اللہ کا وعدہ بھلائی کا ہے

ملاحظہ فرمائیے! اللہ تعالیٰ نے سابقین اولین کو کیا مقام دیا ہے اور ان ہی پر اس حکم مذکور کی تخفیف تھی اور یہ تخفیف اس وقت سے لیکر آج تک ہے اور قیامت تک رہے گی لیکن مودودی صاحب نے تشریح کو بالکل لوٹ دیا ہے اور بلا جھجک سابقین اولین کے بارے میں موٹے موٹے تنقیدی الفاظ بول دیئے ہیں لیکن اس پر غور یہ جرأت ملاحظہ فرمائیے۔

خیال یہ ہے کہ یہ ارشاد ۲ھ کا ہے جبکہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ابھی تازہ تازہ ہی داخل اسلام ہوئے تھے ص۵۸!

یعنی مودودی صاحب کے الفاظ میں ۲ھ تک (شرکاء بدر تک) جو لوگ تازہ تازہ اسلام میں داخل ہوئے تھے ان کی اخلاقی تربیت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے اور ان کے شعور کی حد بالغ نہ ہونے کی وجہ سے یہ حکم تخفیف ہوا اور اس کے بعد پھر وہی حکم نافذ کر دیا گیا جو پہلے تھا میری رائے تو یہ ہے کہ مودودی صاحب کی فہم اور ان کا شعور بالغ نہیں ہوا تجربات کو سیکھے بغیر لکھنا شروع کر دیا۔ بندۂ خدا! پہلا حکم تخفیف کا ہر

یا تخفیف کا حکم بعد والا ہے؟ ظاہر ہے کہ تخفیف بعد ہی میں آتی ہے تو یہ حکم ان ہی کے الفاظ میں ان حضرات کے لئے نازل ہوا جو سابقین اولین تھے اور کیا ان کی اخلاقی تربیت کامل نہیں ہوئی تھی اور ان کا شعور بلوغ کی حد کو نہیں پہونچا تھا۔ کتنی بچکانہ بات کہی ہے کہ نابالغ اور جاہل بچہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اسی کے ساتھ ... مودودی صاحب کے دیباچہ کے الفاظ اور ملاحظہ فرمایئے :-

جہاں تک سورۃ کے مضمون پر غور سے اندازہ ہوتا ہے غالباً یہ سورۃ ایک ہی تقریر ہے جو بیک وقت نازل فرمائی گئی ہے۔ ص ۱۱۸ ج ۳

یعنی حکم تخفیف اور حکم عزیمت دونوں حکم ایک ہی ساتھ نازل ہوئے ہیں خیال فرمایئے یہ تضاد کیسا؟ مودودی صاحب کی اس غلطی کی طرف سورۂ انفال کی ایک دوسری آیت سے اشارہ ہوتا ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا	ایمان والو! اللہ اور اسکے
تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	رسول کے معاملہ میں خیانت نہ کرو۔

صحیح روایات کی بنا پر یہ آیت حضرت ابولبابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ انہوں نے یہود بنی قریظہ رض کو حضرت سعد بن معاذ رضؓ کے حکم ہونے کے بارے میں اطلاع کردی تھی اور اس کا اعتراف کر لیا تھا تب اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا تھا یہ واقعہ ۵ھ کا ہے تمام اہل تفسیر نے صحیح روایات کی بنیاد پر آیت کے اس شان نزول پر اتفاق کیا ہے، اب غور فرمایئے! کجا ۲ھ غزوۂ بدر کے حالات اور کجا ۵ھ کتنا بڑا فرق ہے ان سب کو مودودی صاحب نے کہدیا ہے کہ ایک ہی تقریر ہے اور غزوۂ بدر کے بعد ۲ھ میں نازل ہوئی ہے۔

التوبہ

سائحون کون؟

اَلْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ

اس کی بندگی بجالانے والے اسکی تعریف کے گن گانے والے اسکی خاطر زمین میں گردش کرنے والے اسکے آگے رکوع اور سجدہ کرنے والے صفحہ ۲۴ ج ۲

سائحون کون ہیں؟ اس کے بارے میں مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے

متن میں لفظ "السائحون" استعمال ہوا ہے جس کی تفسیر بعض مفسرین نے "الصائمون" روزہ رکھنے والے سے کی ہے لیکن سیاحت کے معنی روزہ معنی مجازی ہیں اصل لغت میں اس کے معنی یہ نہیں ہیں اور جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ معنی بیان فرمائے ہیں اسکی نسبت حضورؐ کی طرف درست نہیں ہے الخ فائدہ ۱۰۹ ص ۲۴۰

مودودی صاحب نے اس جگہ سائحون کے معنی الصائمون کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ بعض مفسرین کا قول ہے حالانکہ بات اس کے برعکس ہے بلکہ یہی معنی اکثر مفسرین نے بیان کئے ہیں۔ مثلاً حضرات صحابہ رضؓ میں سے حضرت ابو ہریرہ رضؓ، حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ابن عباس رضؓ، حضرت عکرمہ رضؓ اور تابعین میں سے مجاہد، سعید بن جبیر، عطاء، محمد بن کعب قرظی ابو عبدالرحمٰن السلمی، ابو مالک، ابراہیم نخعی، حسن، قتادہ، ضحاک، ربیع بن انس، سدی اور معنی ثانی زید بن اسلم اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے

نے بیان کئے ہیں[۱] اور علامہ زمخشری نے سورۂ تحریم کی تفسیر میں کہا ہے،

صائم کو سائح کہا گیا ہے کیونکہ اس کے پاس توشہ نہیں ہوتا
اسلئے جب تک کھانے کو نہ ملے رکا رہتا ہے پس روزہ دار
کو افطار کا وقت آجانے تک رک جانے سے تشبیہ دی ہے[۲]

گویا کہ روزہ دار کے لئے سائحون کا لفظ استعارۃً بلاغت کلام کی وجہ سے استعمال کیا گیا ہے[۳] اسی معنیٰ مجازی کو سفیان بن عیینہ کے حوالہ سے علامہ بغوی رح نے بھی اختیار کیا ہے[۴] اور یہی معنیٰ مندرجہ بالا آیت اور سورۂ تحریم کی آیات میں اولیٰ ہیں[۵] سورۂ تحریم کی آیات سے صاف ظاہر ہے

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ	اگر نبی چھوڑ دے تم سب کو ابھی
اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا	اس کا رب بدلہ میں دیدے اسکو
مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ	عورتیں تم سے بہتر حکم بردار
قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ	یقین رکھنے والیاں نماز میں
سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا	کھڑی ہونے والیاں توبہ کرنے
	والیاں، بندگی بجا لانے والیاں

روزہ رکھنے والیاں، بیاہیاں اور کنواریاں۔

اس جگہ اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ سائحات سے مراد (مودودی صاحب کے ترجمہ کے مطابق) زمین پر گردش کرنیوالیاں مراد نہیں ہوسکتا۔ یہی معنیٰ مجازی بوجہ اشتراک وجہ شبہ سورۂ توبہ میں ہیں معنیٰ لغوی دوسری جگہ ہیں۔

فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (توبہ)	زمین میں چار مہینے چلو

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ص۳۹۰ ج ۴ [۲] لغات القرآن ص۱۶۷ ج ۳ [۳] روح المعانی ص۳۱ ج ۱۱۔
[۴] مظہری ص۲۰۳ ج ۴ بیضاوی ص۲۲۱ ج ۲ [۵] ابن کثیر ص۳۹۰ ج ۴

اس لیئے سب جگہ یکساں معنی مراد لینا اور جمہور کے مقرر کردہ معنی کو ہٹنا، میں نہیں جانتا کہ علم اور فہم کا کونسا مقام ہے رہی یہ بات کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت درست نہیں ہے اس سے کیا مراد ہے ؟ صاف کہنا چاہیئے کہ وہ حدیث مرفوع نہیں ہے یا فلاں حیثیت کی ہے ایک گول بات کہہ کر نکل جانا معیاری تحقیق نہیں کہلاتا بلکہ جن لوگوں کے لیئے یہ تفسیر لکھی گئی ہے ان کو گمراہ کرنے کے ....

مترادف ہے اگر علماء کے لیئے لکھی جاتی تو ہم یہ بات نہ کہتے۔ اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ حضور کی طرف یہ حدیث منسوب ہے یا نہیں ؟ اس باب میں احادیث مرفوعہ یہ ہے اس کو ابن جریر نے حضرت ابوہریرہ رض سے روایت کیا ہے :

۱۔ السائحون ھم الصائمون	۱۔ سائحون روزہ دار ہیں۔
۲۔ سئل النبی صلے اللہ علیہ وسلم عن السائحین فقال ھم الصائمون	۲۔ حضور سے سائحون کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ روزہ دار۔

۳۔ حضرت ابن مسعود رض نے ارشاد فرمایا : السائحون سے مراد روزہ دار ہیں

۴۔ اور حضرت ابن عباس رض نے تو اس سے بھی زیادہ ترقی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں السیاحۃ آیا ہے اس سے روزہ مراد ہے۔

۵۔ حضرت عائشہ رض نے فرمایا اس امت کی سیاحت روزہ ہے[1]

ان روایات میں بعض مرفوع ہیں بعض موقوف ہیں لیکن صحیح ہیں بعض مرسل ہیں لیکن صحیح ، اس کے باوجود مودودی صاحب کا ارشاد کہ حضور کی طرف نسبت درست نہیں ہے ان کی وسعت نظر پر دلالت نہیں کرتا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۳۹۲ ج ۲

اَوّاہ کیا ہے؟

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ — حق یہ ہے کہ ابراہیم بہت رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا ۱۲۲ ج ۲

مودودی صاحب نے اس جگہ آیت میں سیاق و سباق کے اعتبار سے ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ گھبرائے سے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ جلدی میں بلا غور کئے تحریر کر دیا ہے:

متن میں اوّاہ اور حلیم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اوّاہ کے معنی بہت آہیں بھرنے والا، زاری کرنے والا ڈرنے والا حسرت کرنے والا [۱]

پوری کتاب میں مودودی صاحب کی یہ عادت ہے کہ وہ بائیبل کا جس ذوق کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں اتنی ہی رغبت کے ساتھ وہ اسلامیات کے حوالوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ اب اس لفظ کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے اور پھر احادیث کی روشنی میں آیات کے سیاق و سباق کو نظر میں رکھتے ہوئے منتخب فرمائیے کہ اس جگہ اوّاہ کے کونسے معنی زیادہ موزوں ہیں اوّاہ کے بارے میں سلف سے اتنے اقوال مروی ہیں۔

بہت زیادہ دعا کرنے والا، مومن، فقیہ، رحمدل، مومن توّاب، تسبیح حق سبحانہ تعالیٰ میں مشغول رہنے والا، کثرت سے ذکر کرنے والا، کتاب اللہ کی بہت تلاوت کرنے والا خشیت الٰہی کی بنا پر بہت آہ کرنے والا، دربار الٰہی میں خشوع و خضوع کرنے والا، حبشی زبان میں مومن کو کہتے ہیں معلّم خیر، وعدہ کو پورا کرنے والا، گناہوں کو یاد کرکے استغفار کرنے والا، شفیق، ہر بری بات سے رجوع کرنے والا [۲]

امام ابو جعفر بن جریر طبری فرماتے ہیں:۔

---

[۱] تفہیم القرآن فائدہ ۱۱۳ ص ۲۴۲ [۲] لغات القرآن از تفسیر فتح البیان ص ۲۹۱ ج ۱

ان سب اقوال میں اولےٰ اس شخص کا قول ہے جو اس کے معنی بہت زیادہ دعا کرنے والا بیان کرتا ہے، سیاق قرآن کے بھی یہی معنی مناسب ہیں کیونکہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ اپنے باپ کے لیۓ ان کی طلب مغفرت ایک وعدہ کی بنا پر تھا اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے باپ سے وعدہ کر لیا تھا اور حضرت ابراہیم بہت دعا کرنے والے تھے [1]

وہ آیات کہ جن کے سیاق و سباق کی طرف امام ابوجعفر نے اشارہ کیا ہے اور جن کا مذکورہ ترجمہ مودودی صاحب نے کیا ہے یہ ہیں

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ	اور ابراہیم کی استغفار اپنے باپ
إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا	کے لیۓ اس وعدہ کی بناء پر تھی
عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا	جو انہوں نے اس سے کیا تھا
إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ	پس جب ان کو ظاہر ہو گیا کہ
أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ	وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے
مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ	بریئت اختیار کی بیشک ابراہیم
حَلِيمٌ	بہت دعا کرنے والے بردبار تھے

اور ابن جریر ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے عبداللہ بن شداد بن الہاد سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اواہ کون ہے؟ فرمایا خشوع و خضوع کرنے والا بہت دعا مانگنے والا یہ حدیث مرسل صحیح ہے [2]

مودودی صاحب کے مقرر کردہ معنی اگرچہ زیادہ قابل گرفت نہیں ہیں مگر ہمارا یہ تبصرہ ان کے اس دعوے کی بنیاد پر ہے جو وہ اپنے دیباچہ میں

---

[1] لغات القرآن صفحہ ۲۹۲ ج ۱ [2] تفسیر ابن کثیر و لغات القرآن صفحہ ۲۹۲ ج ۱

کر آئے ہیں اور براہ راست اپنی فہم پر اعتماد کیا ہے اور سیاق کلام کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے

بلا تبصرہ

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کر دیا جن کے معاملہ کو ملتوی کر دیا گیا تھا جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی ص۲۴۱ ج ۲

قرآن پاک کی ان آیات کی تفسیر میں حدیث شریف میں تین مخلص صحابہ رضی حضرت کعب بن مالک رضی، ہلال بن امیہ رضی، مرارہ بن ربیع رضی کا قصہ نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اس قصہ سے جن الفاظ میں مودودی صاحب نے جو نتائج اخذ کیے ہیں اور ان کے الفاظ جس درجہ کے ہیں صرف ان جملوں اور اس عبارت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

۱۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس سارے قضیہ میں لیڈر جس شان سے سزا دیتا ہے اور پیرو جس شان سے اس سزا کو بھگتا ہے اور پوری جماعت جس شان سے اس سزا کو نافذ کراتی ہے الخ

۲۔ لیڈر نہایت سخت سزا دے رہا ہے مگر غصے اور نفرت کے ساتھ نہیں گہری محبت کے ساتھ دے رہا ہے الخ

۳۔ اگر قصور کر کے وہ اکڑتے اور اپنے لیڈر کی ناراضی کا جواب غصہ اور عناد سے دیتے۔ (ماخوذ از فائدہ ص۱۱۹)

اس جگہ دکھلانا یہ ہے کہ نتیجہ اخذ کرنے میں مودودی صاحب نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک لیڈر قرار دیا ہے، یہ صرف ان کی ہمت کی بات ہے اس پورے قیاس میں مودودی صاحب نے اپنی جماعت کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے ارکین جماعت کو بوقت ضرورت سزا دینے

کے جو اختیارات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس سزا دینے میں ارکین جماعت کو بہر حال نہ صرف وفادار بلکہ مسلوب الاختیار غلام کے صفات اختیار کرنے کی جو تلقین فرمائی ہے وہ ان کے اس اصول

"کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہوا جائے"

کی موجودگی میں عجیب تو ہے ہی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غمازی کر رہا ہے کہ اراکین جماعت ان کو پسند نہیں کرتے اور وہ ہیں کہ اپنی قوت استدلال کے بل بوتے پر قرآن کی روشنی میں اپنے کو لیڈری قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کے اس ذہن کی ترجمانی جناب امین احسن اصلاحی اور دیگر اراکین جماعت اسلامی نے جماعت سے علیحدگی پر ان الفاظ کے ساتھ کی ہے

میں نے چودہ سال کے بعد ایک گم کردہ راہ قافلہ کا ساتھ چھوڑا ہے۔

(امین احسن اصلاحی)

تقریر اعتراض

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

اور کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے ص۲۵۰

اس آیت پاک کی تشریح میں فقہ اسلامی پر جن الفاظ کے ساتھ مودودی صاحب نے تنقید کی ہے وہ یہ ہے

اس آیت میں لفظ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ جو استعمال ہوا ہے اس سے بعد کے لوگوں میں ایک عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کے زہریلے اثرات ایک مدت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم بلکہ ان کی مذہبی زندگی پر بھی بری طرح چھائے ہوئے ہیں اللہ تعالے نے

تو تفقہ فی الدین کو تعلیم کا مقصود بتایا تھا جس کے معنی ہیں دین کو سمجھنا اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا اور اس قابل ہو جانا کہ فکر و عمل کے ہر گوشہ اور زندگی کے ہر شعبہ میں انسان یہ جان سکے کہ کونسا طریق فکر اور کونسا طرز عمل روح دین کے مطابق ہے۔ لیکن آگے چل کر جو قانونی علم اصطلاحاً فقہ کے نام سے موسوم ہوا اور جو رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کی محض صورت (بمقابلہ روح) کا تفصیلی علم بن کر رہ گیا لوگوں نے اشتراک لفظی کی بناء پر سمجھ لیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جس کا حاصل کرنا حکم الٰہی کے مطابق ہے تعلیم کا منتہائے مقصود ہے حالانکہ وہ کل مقصود نہیں بلکہ ایک جزء مقصود تھا اس عظیم الشان غلط فہمی سے جو نقصانات دین اور پیروانِ دین کو پہونچے ہیں ان کا جائزہ لینے کے لئے تو ایک کتاب کی وسعت درکار ہے ص۲۵۳ فائدہ نمبر ۱۲۰

مشہور مقولہ ہے

النّاس اعداءٌ ما جہلوا — لوگ جس چیز سے ناواقف ہوتے ہیں اسکے دشمن ہوتے ہیں۔

اولاً تو یہ چیز قابل لحاظ ہے کہ مودودی صاحب نے تفقہ فی الدین کے تعارف میں جو چند امور تحریر فرمائے ہیں فقہ اسلامی میں ان کے علاوہ کچھ اور ہے کہ جس کے بارے میں ابتدائی جملوں میں بھی سخت تنقید کر دی ہے اور رہی سہی کسر اس آخری جملوں میں نکال لی ہے مودودی صاحب کی ذمہ داری تھی کہ بتلاتے کہ اصطلاحی فقہ یہ ہے اور حقیقت فقہ یہ ہے۔ اگر اصطلاحی فقہ وہ سب کچھ نہیں ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے تو ان کو حق تنقید تھا۔ یہ بھی کیسی عجیب فہم ہے کہ اس جگہ تو فقہ پر یہ تنقید لیکن

خلافت اور ملوکیت میں امام ابوحنیفہ رح اور تدوین فقہ میں ان کی جدوجہد پر جو قصیدہ خوانی کی ہے اسکو پڑھنے والے جب مذکورہ اقتباس کو پڑھتے ہیں تو یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس شخص کو رات کا کھایا بھی یاد نہیں رہتا، خواہ مخواہ الفاظ اور جملوں کے پھیلاؤ کو ماہی گیر کا جال بنانے کی فضول سی عادت ہے۔

ہمیں اصطلاحی فقہ کا تعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر ہم یہ تعارف کرانے بیٹھ جائیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم بھی کوئی جال تیار کر رہے ہیں ہمارے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مودودی صاحب نے تفقہ فی الدین کے بارے میں جو امور شمار کرائے ہیں فقہ اصطلاحی ان کے علاوہ کوئی شے دیگر نہیں ہے۔

یونس

ہجرت کیطرف اشارے

تفہیم القرآن کے مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک اور خود مودودی صاحب کے نزدیک اس کتاب میں سب سے زیادہ کمال یہ ہے کہ انہوں نے سورتوں کا زمانہ نزول متعین کیا ہے اگرچہ وہ اپنے اس دعوے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں ہم نے ان کے اس موضوع کا تفصیلی تعاقب اپنی کتاب "تاریخ الاحکام" میں کیا ہے۔ اس جگہ ہمیں ان کے اس زعم کی کمزوری ظاہر کرنا مقصود ہے سورۂ یونس کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

لیکن اس سورت میں ہجرت کی طرف کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا اسلئے اس کا زمانہ نزول ان سورتوں سے پہلے کا سمجھنا چاہیئے جن میں کوئی نہ کوئی خفی یا جلی اشارہ ہم کو ہجرت کے متعلق ملتا ہے ص۲۵۸ ج۲

خلافت اور ملوکیت میں امام ابوحنیفہ رح اور تدوین فقہ میں ان کی جدوجہد پر جو قصیدہ خوانی کی ہے اسکو پڑھنے والے جب مذکورہ اقتباس کو پڑھتے ہیں تو یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس شخص کو رات کا کھایا بھی یاد نہیں رہتا، خواہ مخواہ الفاظ اور جملوں کے پھیلاؤ کو ماہی گیر کا جال بنانے کی فضول سی عادت ہے۔

ہمیں اصطلاحی فقہ کا تعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر ہم یہ تعارف کرانے بیٹھ جائیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم بھی کوئی جال تیار کر رہے ہیں، ہمارے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مودودی صاحب نے تفقہ فی الدین کے بارے میں جو امور شمار کرائے ہیں فقہ اصطلاحی ان کے علاوہ کوئی شے دیگر نہیں ہے۔

یونس

ہجرت کیطرف اشارے

تفہیم القرآن کے مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک اور خود مودودی صاحب کے نزدیک اس کتاب میں سب سے زیادہ کمال یہ ہے کہ انہوں نے سورتوں کا زمانہ نزول متعین کیا ہے اگرچہ وہ اپنے اس دعوے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں ہم نے ان کے اس موضوع کا تفصیلی تعاقب اپنی کتاب "تاریخ الاحکام" میں کیا ہے۔ اس جگہ ہمیں ان کے اس زعم کی کمزوری ظاہر کرنا مقصود ہے سورۂ یونس کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

لیکن اس سورت میں ہجرت کی طرف کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا اسلئے اس کا زمانہ نزول ان سورتوں سے پہلے کا سمجھنا چاہیئے جن میں کوئی نہ کوئی خفی یا جلی اشارہ ہم کو ہجرت کے متعلق ملتا ہے ص۲۵۵ ج۲

اتنی بات تو درست ہے کہ سورۃ یونس کا نزول ان سورتوں سے پہلا ہے جن میں ہجرت کی طرف خفی یا جلی کوئی اشارہ ہے لیکن سورۃ یونس میں اس قسم کا کوئی دور کا اشارہ یا دور کی دلالت موجود نہیں ہے جو انہی کے الفاظ میں اس سورۃ کے مضامین کی داخلی شہادتوں کے خلاف ہے چنانچہ سورت میں چند امور ایسے ذکر کیا ہوا ہے اس سورت سے پہلے نازل ہونے والی سورتوں کو سمجھا ہیں اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جس احتمال کو کسی اہل تفسیر نے اٹھایا ہی نہیں آپ خواہ مخواہ اس کے اشارے کے اٹھا رہے ہیں اور تردید کر رہے ہیں کسی چیز کی نفی کسی نہ کسی درجہ میں اس کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔

چند متفرقات

۱۔ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَا اِلٰى رَجُلٍ	کیا لوگوں کے لیے یہ عجیب بات ہوئی کہ ہم نے خود انہیں میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا ہے ص۲۶۱ ج۲

وحی کا ترجمہ اس جگہ یا اسی قسم کی دوسری جگہ اشارہ سے کرنا مناسب نہیں ہے لفظ اشارہ وحی کے مفہوم کا کو نہیں ظاہر کرتا

وحی وہ کلام الٰہی ہے جو بصورت القاء یا تعلیم جبرئیل کے ذریعہ سے ہو[1]

وحی کا صحیح ترجمہ وحی ہے اور ترجمہ کی ضرورت اس وقت پیش آئے جب کہ لوگ اس کو نہ جانتے ہوں جیسا کہ بیشتر جگہ وحی کا ترجمہ لفظ وحی سے خود مولوی صاحب نے بھی کیا ہے

۲۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ	پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے

[1] لغات القرآن صفحہ ۱۲۰ ج ۶

اَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ — یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ صـ ۲۷۴ ج ۲

اس آیت کی تشریح میں مودودی صاحب نے فائدہ ۲۲ میں تحریر فرمایا ہے:-

بعض نادان لوگ فلاح کو طویل عمر یا دنیا وی خوشحالی یا دنیوی فروغ کے معنی میں لیتے ہیں اور پھر اسی آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعوے کر کے جیتا رہے یا دنیا میں پھلے پھولے یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو اسے نبی برحق مان لینا چاہیئے کیونکہ اس نے فلاح پائی ہے اگر وہ نبی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعوے کرتے ہی مار دیا جاتا یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دنیا میں اس کی بات نہ چلنے پاتی۔ لیکن یہ احمقانہ استدلال وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح فلاح کا مفہوم جانتا ہو اور نہ اس قانون امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالےٰ نے مجرموں کے لئے مقرر فرمایا ہے الخ

اس کے بعد فلاح کے معنی اور اس کی تحقیق مودودی صاحب نے بہت تفصیل سے کی ہے جو ٹھیک ہے ہمیں اس جگہ اس قدر عرض کرنا ہے کہ مودودی صاحب اس آدمی کو جانتے ہیں جس نے غیر منقسم ہندوستان میں دعوے نبوت کیا تھا (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) لیکن مودودی صاحب صاف طور پر تبلاتے ہوئے جھجک رہے ہیں آخر کیوں؟

۲۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ — کہو تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لئے

حَرَامًا وَّ حَلٰلًا — اتارا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام کسی کو حلال ٹھہرالیا ص۲۹۳

اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں

اردو زبان میں رزق کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے اسی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں گرفت صرف اس قانون سازی پر کی گئی ہے جو دستر خوان کی چھوٹی سی دنیا میں مذہبی اوہام یا رسم ورواج کی بناء پر لوگوں نے کر ڈالی ہے اس غلط فہمی میں جہلاء اور عوام ہی نہیں علماء تک مبتلا ہیں حالانکہ عربی زبان میں رزق محض خوراک کے معنی تک محدود نہیں ہے بلکہ عطا اور بخشش اور نصیب کے معنی میں عام ہے [1]

اس شخص کو زیادہ الفاظ بولنے کا کچھ مرض ہے رزق کے معنی کی غلط فہمی میں علماء کو بھی لپیٹ لیا حالانکہ ان کو تفسیر کی ابتدائی کتاب جلالین جو پڑھائی جاتی ہے اس میں مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ ای اعطیناهم پڑھایا گیا ہے رہی مذکورہ آیت کی بات تو آپ خود ہی فرمائیں آیت میں خطاب مشرکین مکہ سے ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس میں ان کے کس عقیدے کی تردید ہے ؟ قرآن پاک میں مذکور ہے

مَا فِي بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا

ان چوپایوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے ۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ رزق کو عطا کے معنی میں نہ استعمال کیا جائے ہمارا اعتراض

[1] تفہیم القرآن ص۲۹۳ ج۲ فائدہ ۳۰

آپ کی بصیرت اور آپ کے مفروضہ پر ہے کہ از خود ایک بات پیدا کی اور دوسروں کو اس سے ناواقف قرار دیدیا۔

۴۔ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لئے مہیا کرو اور اپنے گھروں کو قبلہ ٹھہرالو اور نماز قائم کرو! اور اہل ایمان کو بشارت دیدو

اس آیت کی تشریح فائدہ ۸۴ میں تحریر فرماتے ہیں۔

اس آیت کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے اسکے الفاظ پر اور اس ماحول پر جس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے تھے غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں کہ غالباً مصر میں حکومت کے تشدد سے اور خود بنی اسرائیل کے اپنے ضعف ایمانی کیوجہ سے اسرائیلی اور مصری مسلمانوں کے ہاں نماز با جماعت کا نظام ختم ہو چکا تھا اور ان کے بکھرنے سے ان کی دینی روح پر موت طاری ہوجانے کا ایک بہت بڑا سبب تھا اسلئے حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اس نظام کو از سر نو قائم کریں، اور مصر میں چند مکان اس غرض کے لئے تعمیر یا تجویز کریں، کہ وہاں اجتماعی نماز ادا کی جایا کرے (الی قولہ) ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرانے کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ ان مکانوں کو ساری قوم کے لئے مرکز اور مرجع ٹھہرایا جائے اور اس کے بعد ہی نماز قائم کرو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ متفرق طور پر اپنی اپنی جگہ نماز پڑھ لینے کے بجائے لوگ ان مقررہ مقامات پر جمع ہو کر نماز پڑھا کریں کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں اقامت صلوٰۃ جس

چیز کا نام ہے اس کے مفہوم میں لازماً نماز باجماعت بھی شامل ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مودودی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے ہمیں اس سے اختلاف نہیں ہے لیکن یہ ان کا فکر نہیں ہے بلکہ مفسرین حضرات نے ان تمام اقوال کو بھی بیان کیا ہے اور اس قول کو بھی بیان کیا ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "میں یہ سمجھتا ہوں" ملاحظہ فرمائیے تفسیر مدارک ۲۳۵ اکلیل ص۲۳۴ [1]

سورۃ ہود

ترجمانی میں مشابہت

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ	پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب
مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ	کی طرف سے ایک صاف شہادت
مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ	رکھتا تھا اس کے بعد ایک
مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً	گواہ بھی پروردگار کی طرف
اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ	سے (اس شہادت کی تائید
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ	میں) آگیا اور پہلے موسیٰ کی
الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ	کتاب رہنما اور رحمت کے

طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے) ایسے لوگ تو اس پر ایمان لائینگے اور انسانی گروہوں میں سے جو اس کا

[1] ہکذا تفسیر ابن کثیر، تفسیر مظہری ص۵۵ ج۵ روح المعانی ص۱۱ ج۱۱

انکار کرے تو اس کے لئے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے

صفحہ ۳۳۰ ج ۲

اس آیت کی ترجمانی میں مولانا آزاد نے تحریر فرمایا ہے

پھر دیکھو جو لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک روشن دلیل رکھتے ہوں (یعنی وجدان وعقل کا فیصلہ) اور اس کے ساتھ ہی ایک گواہ بھی اسی طرف سے آگیا ہو (یعنی اللہ کی وحی) اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی پیشوائی کرتی ہوئی اور سرتاپا رحمت آچکی ہو (اور تصدیق کر رہی ہو) تو کیا ایسے لوگ انکار کر سکتے ہیں؟ (نہیں) یہ لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور (ملک کے مختلف) گروہوں میں سے جو کوئی اس سے منکر ہو تو یقین کرو (دوزخ کی آگ ہی) وہ ٹھکانا ہے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے [1]

اس آیت کی دونوں ترجمانیوں میں کس قدر مشابہت ہے؟ ناظرین ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں ہمیں اس سے اختلاف نہیں کہ یہ ترجمانی کیوں ہے لیکن اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ آیت کے اُن ظاہری معنی کو ترک کر دیا ہے جو حضرات تابعین اور بعض صحابہؓ سے ثابت ہیں جو تفسیری اصول کے سراسر خلاف ہیں (ملاحظہ فرمائیے ہمارا مقدمہ) ترجمانی میں مَن کے مفہوم کو عام رکھا گیا ہے اگرچہ ظاہر نص سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے اور یتلوہٗ کے لغوی معنی مراد لئے ہیں اور قرآنی اصطلاح کے معنی تلاوت کو ترک کر دیا گیا ہے [2] تمام صحابہ اور تابعین اور اہل تفسیر کے نزدیک یہ آیت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت اور صداقت کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن دونوں حضرات (مولانا آزاد اور مودودی صاحب) نے اس سے سکوت اختیار کیا ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن صفحہ ۱۸۶ ج ۲ [2] روح المعانی صفحہ ۲۸ ج ۱۲ مظہری صفحہ ۱۴ ج ۲

نامناسب تعبیر بلا تبصرہ

فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ	تو اس بات کی مجھ سے درخواست
بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْ اَعِظُكَ	نہ کر جس کی حقیقت کو تو نہیں
اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ	جانتا میں تجھے نصیحت کرتا ہوں

کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے ص ۳۴۳ ج ۲

یہ خطاب حضرت نوح علیہ السلام سے ہے اس کی تشریح میں فائدہ منہ میں تحریر فرماتے ہیں

اس ارشاد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان کرے کہ حضرت نوح کے اندر روح ایمان کی کمی تھی۔ ایا ان کے ایمان میں جاہلیت کا کوئی شائبہ تھا اصل بات یہ ہے کہ انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہوسکتا کہ ہر وقت اس بلند ترین معیار کمال پر قائم رہے جو مومن کے لئے مقرر کیا گیا ہے بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلےٰ اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہوجاتا ہے ص ۳۴۴ ج ۲

اب ان کے مقابلہ میں مولانا آزاد کا ترجمہ بھی ملاحظہ کیا جائے

خدا نے فرمایا اے نوح! وہ تیرے گھر کے لوگوں میں سے نہیں ہے وہ تو سرتاپا عمل بد ہے) پس جس حقیقت کا تجھے علم نہیں اس بارے میں سوال نہ کر میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ ناواقفوں میں سے نہ ہوجانا (ترجمان القرآن ص ۱۹۳ ج ۲)

اس جگہ ہمیں دو باتیں عرض کرنا ہیں ایک تو یہ ہے کہ نبی کی شان کے مطابق جاہل ترجمہ مناسب ہے یا ناواقف؟ دوسری بات یہ ہے کہ بسا اوقات

انبیاء علیہم السلام کسی نفسیاتی موقعہ پر اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہوجاتے ہیں یہ تعبیر انبیاء علیہم السلام کی شان کے مطابق نہیں ہے بلکہ اس کا لب ولہجہ گستاخانہ ہے بیشک انبیاء علیہم السلام انسان ہی ہوتے ہیں لیکن ایسے انسان کہ جن کی ہر وقت حفاظت ہوتی رہتی ہے

۲۔ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیۡدِیَہُمۡ لَا تَصِلُ اِلَیۡہِ نَکِرَہُمۡ وَ اَوۡجَسَ مِنۡہُمۡ خِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمِ لُوۡطٍ

مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ اس سے مشتبہ ہوگیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا انہوں نے کہا ڈرو نہیں ہم تو لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں ص ۳۵۲

اس کی تشریح میں فائدہ ۷۶ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ خوف اس بناء پر تھا کہ جب ان اجنبی نوواردوں نے کھانے میں تامل کیا تو حضرت ابراہیم کو ان کی نیت میں شبہ ہونے لگا (الی قولہ) لیکن بعد کی آیت اس تفسیر کی تائید نہیں کرتی ص ۳۵۲ ج ۲

اس انداز کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے کی طرف انکے ہاتھ نہ بڑھتے ہی سے حضرت ابراہیم تاڑ گئے تھے کہ یہ فرشتے ہیں الخ فائدہ ۷۷

دل تو اس آیت میں مشتبہ ہوگیا ہی غلط ترجمہ ہے کیونکہ نکر کے معنی اوپرا پن، اجنبیت کے آتے ہیں انداز کلام سے صاف ظاہر ہے کہ اس جگہ لفظ مشتبہ درست نہیں ہے صاف ترجمہ یہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحب نے اختلاف اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے۔

پس جب دیکھا ان کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور

دل میں ان سے ڈرا۔

بات دراصل یہ ہے کہ اہل تفسیر نے اس جگہ یہ بیان کر دیا ہے کہ اہل عرب کا طریقہ تھا کہ اگر کوئی ان کا کھانا نہ کھاتا تو اس سے ان کو اندیشہ ہوتا اور اسکو وہ منکر جانتے تھے علامہ زمخشری نے تفسیر کشاف میں یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھتا نہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تاڑ گئے تھے کہ یہ اللہ کے فرشتے ہیں علامہ زمخشری نے پہلے قول کی تردید کی ہے اور دوسرے کو اختیار کیا ہے اسی کو مودودی صاحب نے بلا نام لیے اپنا کارنامہ قرار دیدیا اور بات وہی کہی جو علامہ زمخشری نے کہی تھی حالانکہ بات کوئی خاص نہیں ہے اب ذرا کتاب اللہ کی روشنی میں دیکھ لیا جائے۔ سورہ ذاریات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے

اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا	جب اندر پہونچے اس کے پاس
سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ	تو بولے سلام، وہ بولا سلام ہے
مُّنْكَرُوْنَ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ	یہ لوگ ہیں اوپرے پھر دوڑا
فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ فَقَرَّبَهٗ	اپنے گھر کو تو لے آیا ایک بچھڑا
اِلَیْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ	گھی میں تلا ہوا پھر ان کے سامنے
فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً	رکھا کہا کیوں کھاتے نہیں

(شیخ الہند)

اس جگہ علامہ زمخشری نے وہی بات اختیار کی ہے جو دیگر مفسرین کی ہر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کی چیز کو اپنی بنا کر نقل کرنے میں بھی عقل کی ضرورت ہے، سورۂ ہود کی آیت میں اجمال ہے اور سورۂ ذاریات میں ذرا تفصیل ہے آیت سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم نے مہمانوں کے آتے ہی فرما دیا تھا یہ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں اس کے بعد وہ کھانا لیکر آئے اگر ان کو مہمانوں کے آتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ... [illegible]

زمانے "قوم منکرون" پھر کھانا لیکر نہ آتے کیونکہ فرشتے انسانی صورت میں آنے کے بعد بھی اپنے ملکوتی صفات پر ہی قائم رہتے ہیں یہ نہیں ہے کہ فرشتے انسانی صورت میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے (جیسا کہ مودودی صاحب نے ہاروت و ماروت کے بارے میں کہا ہے۔) مزید براں یہ کہ جب ان کے سامنے کھانا رکھ دیا اور انہوں نے نہ کھایا تو سوالیہ انداز میں فرمایا کیوں نہیں کھاتے ؟ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو یہ سوال ہی نہ کرتے لہ

ان وجوہات اور قرائن سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم عہ کو یہ کافی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ آنے والے نووارد فرشتے ہیں۔ پہلے معلوم نہیں ہوا تھا۔

سورۂ یوسف

سببِ نزول مودودی صاحب نے مزاج کے خلاف اس سورت کے شانِ نزول میں تحریر فرمایا ہے

بعض کفار نے (غالباً یہودیوں کے اشارے پر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لئے آپ سے سوال کیا کہ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا سبب کیا ہوا۔ چونکہ اہلِ عرب اس قصہ سے ناواقف تھے اس کا نام ونشان تک ان کے ہاں کی روایات میں نہ پایا جاتا تھا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی اس سے پہلے کبھی اس کا ذکر دسنا گیا تھا اسلئے انہیں توقع تھی کہ آپ یا تو اس کا مفصل جواب نہ دے سکیں گے

لہ بریلوی تفسیر ... ابن کثیر ج ۲ ص ۴۵۱ ... ج ۱۲ ص ۹۶

یا اس وقت ٹال مٹول کرنے کے بعد کسی یہودی سے پوچھنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح آپ کا بھرم کھل جائیگا۔ جلد ۲

سورہ یوسف کے شانِ نزول کے بارے میں علامہ ابن کثیر اور صاحب تفسیر روح المعانی نے متعدد روایات ذکر کی ہیں اور صاحب روح المعانی نے قیل کہا گیا ہے۔ یہ صیغہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی قول کی کمزوری ظاہر کرنا مقصود ہوتی ہے) کہہ کر مذکورہ روایت ذکر کی ہے اس روایت میں مزید اضافہ (خط کشیدہ جملہ) مودودی صاحب کی اپنی تصنیف ہے اور وہ بھی تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ کیونکہ یہ سورت مکی ہے اگر مدنی ہوتی تو امکان تھا کہ آپ کسی یہودی سے دریافت کرکے جواب دیتے مگر یہاں اس قسم کے امکانات نہیں تھے ویسے اس روایت کا حال یہ ہے کہ قاضی بیضاوی نے اسکو صرف قول کے درجہ میں اختیار کیا ہے اور لباب النقول والے نے اسکو سرے سے لیا ہی نہیں ہے لہ

ہماری یہ تنقید اس وجہ سے ہے کہ گذشتہ عنوانات میں چند جگہ مودودی صاحب کا یہ ارشاد گذر چکا ہے کہ "اس کی نسبت حضور کی طرف نہیں ثابت ہے۔ یا اس بارے میں کوئی روایت نہیں ہے یا سنداً ثابت نہیں ہے" اور یہاں یہ حال ہے کہ ایک کمزور قول کو اختیار کر لیا ہے

متفرقات

۱۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ	آخر کار انہوں نے اسکو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے صفہ ۳۹ ج ۲

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریر فرمایا ہے

اور پھر انہوں نے یوسف کو بہت کم داموں پر گنتی کے چند درہم

لہ روح المعانی صفہ ۱۷۰ ج ۱۲ بیضاوی صفہ ۲۶۵ ج ۲ مظہری صفہ ۱۳۴ ج ۵ ۔

تھے۔ بازار مصر میں فروخت کیا اور وہ اس معاملہ میں اچھی قیمت لینے کے چنداں خواہشمند بھی نہ تھے [1]

اور حضرت شیخ الہند رح نے ترجمہ میں تحریر کیا ہے۔

اور بیچ آئے اسکو بھائی ناقص قیمت کو دمیں) گنتی کی چونیاں اور ہو رہے تھے اس سے بیزار۔

پہلے دونوں ترجموں میں کس قدر یکسانیت ہے آخر میں صرف امیدوار نہ تھے "خواہش مند نہ تھے" کا فرق ہے، تیسرے ترجمہ میں حضرت شیخ الہند رح نے عربی ادب کی رو سے ترجمہ کیا ہے اس ترجمہ میں قرآن پاک کے منشا کو زیادہ سمجھا گیا ہے کیونکہ قرآن شریف شروع ہی سے ذکر کر رہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی ان سے شروع ہی سے بیزار تھے چنانچہ زاہدین۔ بیچنے والا رَغِبَ عنہ کا ہم معنی ہے اسی کا ترجمہ بیزار کیا ہے رہا دوسرا ترجمہ خواہشمند یا امیدوار تو دور دور تک اس کے لئے کوئی قرینہ نہیں ہے رہا تفسیری اقوال کا معاملہ تو اس بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکال کر ان کے بھائیوں سے خریدا تھا دوسرا قول یہ ہے کہ انھوں نے ان کو مصر جا کر فروخت کر دیا تھا۔ مفسرین نے لغوی اعتبار سے دونوں احتمالات کو لیا ہے اور مولانا آزاد نے بھی دونوں احتمالات بیان کر دئے ہیں مگر مودودی صاحب نے ان میں سے صرف ایک احتمال کو اختیار کیا ہے اور ان کے ترجمہ کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور سیاق کلام کے بھی مطابق نہیں ہے

۲۔ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ	یوسف نے کہا خدا کی پناہ میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی

[1] ترجمان قرآن ص ۲۲۳

إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ — اور میں یہ کام کر دوں ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے ص۳۹۲ ج ۲

اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

عام طور پر مفسرین اور مترجمین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں میرے رب کا لفظ حضرت یوسف ؑ نے اس شخص کے لئے استعمال کیا ہے جس کی ملازمت میں وہ اس وقت تھے اور ان کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ میرے آقا نے تو مجھے ایسی اچھی طرح رکھا پھر میں نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں کہ اس کی بیوی سے زنا کر دوں لیکن مجھے اس ترجمہ اور تفسیر سے سخت اختلاف ہے اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے ص۳۹۲ ج ۲ فائدہ ۲۱

جب کہ مودودی صاحب نے یہ تسلیم کر لیا کہ قرآن میں یہ اعجاز ہے کہ الفاظ کم اور معنی کثیر اور پھر عربی زبان کے اعتبار سے گنجائش ہے تو پھر اختلاف تو کر سکتے ہیں لیکن سخت اختلاف کہہ کر اس گنجائش کی تردید کے سوا اور کیا مراد ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اگر رَبِّیْ بمعنی خالق لیا جائے تب تو سخت اختلاف کی ضرورت ہے اور یہ بات پیغمبر تو پیغمبر بلکہ کسی انسان کے ذہن میں بھی نہیں کہ اس کا آقا (رب) اس کا خالق بھی ہے پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات کس طرح آسکتی تھی ظاہر یہی ہے کہ رب بمعنی خالق مراد نہیں ہے۔ اور محل کلام اس کا مقتضی ہے کہ رب سے اشارہ اگر زلیخا کے شوہر کی طرف ہو تو بھی محل کے اعتبار سے درست ہے کیونکہ اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام خود تو بچے ہوئے تھے لیکن وہ عورت باز نہیں آ رہی تھی اور تھی کافر غلبہ شہوت کی اس منزل پر اس کو بالکل سامنے کی چیز دکھلائی گئی یعنی اسکے شوہر کو یاد دلایا گیا کہ دیکھ تیرے شوہر نے میرے ساتھ کیا کیا ہے تاکہ شوہر کا تصور آتے ہی عورت میں جھجک پیدا ہو[1]

[1] تفصیل ملاحظہ ہو مظہری ص۱۵۲ ج ۵ ۔ روح المعانی ص۲۱۲ ج ۱۲

اور آیت میں یہ معنی مراد لینے کے لئے قرینہ بھی ہے زلیخا کے شوہر نے اسکو حکم دیا تھا اکرمی مثواہُ "اسکو عزت کے ساتھ رکھو۔ اب اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی بات کیطرف اشارہ کیا ہے تاکہ زلیخا کو وہ بات یاد آجائے اس قرینہ کے بعد سخت اختلاف کے لیئے کیا موقع ہے

رہا کلام کا دوسرا مطلب جو مودودی صاحب نے اختیار کیا ہے مفسرین نے اسکو بھی بیان کر دیا ہے اور دونوں کو دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

موجودہ جمہوریت پر تبصرہ

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ

پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کے لئے اسے قید کر دیں حالانکہ وہ اسکی پاکدامنی اور خود اپنی عورتوں کے بُرے اطوار کی صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے

اس جگہ قرآن پاک نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پہ باوجودیکہ جرم ثابت نہیں ہو سکا تھا لیکن مصلحتہً انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل بھیجدیا۔ مودودی صاحب نے اس مفہوم کو بیان کرنے کے بعد غالباً صدر ایوب خاں اور ان کی جمہوریت پر تبصرہ کیا ہے کیونکہ انہوں نے مولانا صاحب کو جیل بھیجدیا تھا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو شرائط انصاف کے مطابق عدالت میں جرم ثابت کیے بغیر بس یونہی پکڑ کر جیل بھیجدینا بے ایمان حکمرانوں کی پرانی سنت ہے اس میں بھی آج کے شیاطین چار ہزار برس پہلے کے اشرار سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں فرق اگر ہے تو بس یہ کہ وہ جمہوریت کا نام نہیں لیتے تھے اور یہ اپنے ان کرتوتوں کیساتھ یہ نام بھی لیتے ہیں۔ وہ قانون کے بغیر اپنی غیر قانونی حرکت کیا کرتے

تھے اور یہ ہر ناروا زیادتی کے لئے ایک قانون بنالیتے ہیں دھان
صاف اپنی اغراض کے لئے دست درازی کرتے تھے اور یہ جس پر ہاتھ
ڈالتے ہیں اس کے متعلق دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ
اس سے ان کو نہیں بلکہ ملک اور قوم کو خطرہ تھا۔ غرض وہ صرف ظالم
تھے یہ اس کے ساتھ جھوٹے اور بے حیا بھی ہیں منہ ۲ فائدہ ۳۵

غور فرمایئے کہاں تفسیر اور کہاں ملکی سیاست اور اپنے انتقامی جذبات کی تسکین
اگر یہی بات ہے تو پھر کہاں حکومت الہیہ اور کہاں اس کا صدر مسٹر فاطمہ جناح
جن کو صدر ایوب خاں کے مقابلہ میں جناب مودودی صاحب نے کھڑا کیا تھا

حسابی غلطی

فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ — اور یوسف کئی سال قید خانے میں پڑا رہا ص۲۱ ج ۲

اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:-

غالباً اس وقت جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام قید کئے گئے ان کی عمر بیس
سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ تلمود میں بیان کیا گیا ہے کہ قید خانے سے
چھوٹ کر جب وہ مصر کے فرمانروا ہوئے تو ان کی عمر تیس سال
تھی اور قرآن کہتا ہے کہ قید خانے میں وہ بضع سنین یعنی کئی سال
رہے بضع کا اطلاق عربی زبان میں دس تک کے عدد کے لئے ہوتا
ہے فائدہ ۳۱ ج ۲ ص ۴۰۱

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک تلمود کی روایت تقریباً ٹھیک ہے لیکن
قرآن پاک نے حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر کے بارے میں کوئی صراحت
نہیں کی ہے مودودی صاحب نے بضع سنین کے بارے میں جو تحقیق بیان
کی ہے اور تلمود کی روایت کی تصدیق کی ہے وہ احادیث اور لغت کے
اعتبار سے غلط ہے یہ بات درست نہیں ہے کہ بضع کا لفظ دس تک
صادق آتا ہے بلکہ بضع دس سے کم عدد پر اطلاق ہوتا ہے قتادہ رح نے

روایت کیا ہے۔

البضع ما بین الثلاث الی التسع — بضع تین سے لیکر ۹ تک پر اطلاق ہوتا ہے

جمہور نے یہی فرمایا ہے اور بعض نے تین سے لیکر سات تک اور بعض نے تین سے لیکر پانچ تک کہا ہے [1]

حدیث شریف میں موجود ہے۔

الایمان بضع وسبعون شعبۃ — ایمان کے ستر سے کچھ زیادہ شعبے ہیں۔

یہ حدیث صحیح ہے جس سے ثابت ہے کہ ایمان کے شعبے ستر سے زیادہ اور اسّی سے کم ہیں جس سے معلوم ہوا کہ دہائی کا ہندسہ بضع کا مصداق نہیں ہے سورہ روم میں مذکور ہے

وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ (روم) — اور رومی اہل فارس کے غلبہ کے بعد عنقریب چند سالوں میں غالب آجائینگے

اس آیت کی تفسیر میں تمام مفسرین نے دس سال سے کم کو بیان کیا ہے اور استدلال میں وہ حدیث بیان کی ہے کہ جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور ابی بن خلف کے درمیان شرط قرار پائی تھی اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے فرمایا تھا کہ رومی تین سال میں غالب آجائیں گے جب اس واقعہ کی اطلاع حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے حضورؐ کو کی تو آپ نے فرمایا جاؤ اونٹوں کی تعداد میں بھی اضافہ کردو اور مدت میں بھی اضافہ کردو اور فرمایا ۹ سال کی مدت اور بعض روایات میں ہے سات سال کی مدت مقرر

---

[1] روح المعانی صـ۲۳۴ ج ۱۲ مظہری صـ۱۶۵ ج ۵۔ ابن کثیر صـ۲۷۹ ج ۲ بیضاوی صـ۲۷۱ ج ۲ اکلیل صـ۲۶ مـ۵ لغات القرآن صـ۶۵ ج ۲

کرلو! اور یہی مدت مقرر کرلی گئی یہ حدیث صحیح ہے اور سورۂ روم کی تفسیر میں تفسیر و سیرت کی تمام کتابوں میں مذکور ہے غرضکہ تلمود کی تصدیق میں جو کچھ مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے وہ غلط ہے۔

ایک اختلاف

اَلْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ	عزیز کی بیوی بول اٹھی اب حق کھل چکا ہے وہ میں ہی تھی کہ جس نے پھسلانے کی کوشش کی تھی بیشک وہ بالکل سچا ہے (یوسفؑ نے کہا) اس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیز یہ جان لے کہ میں نے در پردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا

تا ۵۲ ۵۱

بات دراصل یہ ہے کہ جب مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بریٔت کی اور ان کی پاکدامنی پر شہادت دی تو عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) کو بجز اعتراف جرم کے کوئی چارہ نہ رہا اس لئے اس نے کہا

اب چونکہ اصلیت ظاہر ہو چکی ہے میں نے ہی اسکو پھسلایا تھا اور وہ سچا ہے (اور اس اقرار کے باوجود) عزیز (میرے شوہر) کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بجز اس حرکت کے (کہ بربنائے عشق مجھے معذور سمجھا جائے) میں نے اپنے شوہر کی اصل ملکیت میں خیانت نہیں کی یعنی مجھ سے زنا کا ارتکاب نہیں ہوا۔

اس تقریر میں ضمناً ایک شبہ کی بھی تردید ہوئی وہ یہ کہ عزیز مصر کو خیال ہو سکتا تھا کہ جو عورت باعتراف خود مجرم ہے وہ یقیناً اس واقعہ سے پہلے کسی شخص دیگر کے ساتھ بھی ملوث رہ سکتی ہے (ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ)

اس جواب میں زلیخا نے اس مخصوص واقعہ اور اس سے ماقبل کی بھی نفی کر دی
یہ تقریر سیاق وسباق کلام کے عین مطابق ہے کیونکہ عبارت قرآن
اس واقعہ کے بارے میں یہاں سے شروع ہے ۔

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ — عزیز کی عورت نے کہا اب حق
اَلْاٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ — ظاہر ہو گیا ۔

اور جس جگہ (دربار شاہی) میں اس نے اور دیگر عورتوں نے اعتراف کیا
وہاں حضرت یوسف علیہ السلام موجود نہیں تھے وہ تو اس ثبوت کے ہو چکنے
کے بعد ہی جیل سے باہر آئے تھے محل کلام اس کا مقتضی ہے کہ زلیخا اعتراف
کے ساتھ اپنی بریت بھی کرے اس طرح پورا کلام مربوط ہو جاتا ہے اور
درمیان میں کوئی محذوف نہیں ماننا پڑتا اسی عبارت سے متصل اگلا جزو ہے

وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ — اور میں اپنے نفس کی بریت
النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ — نہیں کرتی ہوں نفس تو بہت
زیادہ برائی کا حکم کرتا ہے

اس اعتراف میں زلیخا نے مزید اپنی عدم خیانت اور اعتراف جرم بقدر مذکور کی
صفائی پیش کر دی ۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ تقریر فرما کر کہا ہے

یہی قول سب سے زیادہ مشہور ہے اور زیادہ لائق ہے اور سیاق
قصہ اور معنی کلام کے زیادہ مناسب ہے اور اسی کو ماوردی نے
بھی اپنی تفسیر میں حکایت کیا ہے اور اسکی تائید میں ابن تیمیہ نے
مستقل ایک رسالہ تصنیف کیا ہے ۔ ابن کثیر ص ۴۸۱ ج ۲

اس تقریر پر جناب مودودی صاحب نے ابن تیمیہ اور ابن کثیر جیسے فضلاء
کا نام لیکر تنقید کی ہے
لیکن مجھے تعجب ہے کہ ابن تیمیہ جیسے دقیقہ رس آدمی تک کی نگاہ سے

لہ مولانا شبیر احمد عثمانی [illegible] بیان کیا ہے

یہ بات کیسے چوک گئی کہ شان کلام بجائے خود ایک قرینہ ہے
جس کے ہوتے کسی اور قرینہ کی ضرورت نہیں رہتی یہاں تو شان
کلام صاف کہہ رہی ہے کہ اس کے قائل حضرت یوسف ہی ہیں

فائدہ: ۴۶ ص ۴۱۱ ج ۲

ہمیں اس ردوکد میں تو پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کلام حضرت یوسف علیہ السلام کا نہیں ہو سکتا کیونکہ کلام میں کچھ محذوف مان لینے کے بعد یہ مطلب ہوگا۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو خبر دی گئی کہ بادشاہ نے عورتوں کو بلا کر تصدیق کر لی ہے اور عزیز کی بیوی نے بھی اعتراف کر لیا ہے کہ وہ قصوروار ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہ جو کچھ میں نے کیا ہے یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ بادشاہ کو اور عزیز مصر اور سب کو معلوم ہو جائے کہ عزیز مصر کی میں نے خیانت نہیں کی ہے

اسلئے کلام میں دونوں طرح کی گنجائش ہے جب یہ حقیقت ہے تو پھر دوسرے پر تنقید بے فائدہ! حقیقت یہ ہے مودودی صاحب نے علامہ ابن تیمیہ کا وہ رسالہ نہیں دیکھا اور حافظ ابن کثیر کی اتنی عبارت پر نظر ڈالنے کے بعد تنقید کر بیٹھے اور اس کے بعد والے قرینہ پر محض تنقید کی جلد بازی کی وجہ سے نظر نہیں کی۔ بعد والا قرینہ یہ ہے کہ کلام میں نفس امارہ کا ذکر ہے اور انبیاء علیہم السلام کا نفس نفس مطمئنہ ہوتا ہے نہ کہ نفس امارہ۔ نفس امارہ تو عام انسانوں کا ہوتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ میرا نفس نفس امارہ ہے یعنی پاکدامنی کا ثبوت ہو چکنے کے بعد پھر ایک نئی بات شروع کر دیتے جس سے پھر اذہان پلٹ سکتے تھے اور وہم کا شائبہ ہو سکتا تھا کیونکہ قرآن پاک میں ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اگر

حضرت یوسف علیہ السلام برہان رب کو نہ دیکھ لیتے تو ارادہ کر لیتے لیکن چونکہ ان کو عین وقت پر برہان رب دکھلائی دے گئی اسلئے انہوں نے اس فعل کا ارادہ بھی نہیں کیا یعنی ارادہ وغیرہ سب کچھ امراۃ عزیز کی جانب سے تھا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے اس قول کو نقل فرمایا ہے

یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا	یوسف اس (عورت) سے درگذر
وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ	کر (اور اے عورت) تو اپنے
كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـئِیْنَ	گناہ کی معافی مانگ تو ہی خطاوار ہے

کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام پہلے ہی فرما چکے

هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ	اسی عورت نے مجھے پھسلانے کی کوشش کی تھی

رہی قرینہ والی بات۔ قرینہ دو قسم کا ہوتا ہے قرینہ لفظی اور معنوی یا قرینہ مقالی اور حالی۔ قرینہ معنوی (جس کو شان کلام کہا ہے) اسوقت مراد ہوتا ہے جب الفاظ میں قرینہ نہ ہو۔ اس کے بعد مزید قرینہ اور دیکھیے

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ	بادشاہ نے کہا (اب) اسکو میرے پاس لے آؤ۔

اگر یہ جملہ پہلے ذکر کیا جاتا تب تو یہ بات تھی کہ بادشاہ نے جب قاصد کو بھیجا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے یہ جو طریقہ اختیار کیا وہ اس وجہ سے تھا کہ عزیز مصر کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے خیانت نہیں کی بادشاہ نے تو سب واقعہ ہو چکنے کے بعد اطلاع کی اور قاصد کو بھیجا اسلیے صاف ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کو تحقیق حال کی اطلاع بعد میں ہوئی تھی اسلئے وہ قول امراۃ عزیز ہی کا تھا یہی سیاق کلام ہے لیکن اگر امراۃ عزیز کے اعتراف اور قول کے علاوہ دوسرا مطلب بھی مراد لیا جائے تو گنجائش ہے لیکن ... [illegible]

تخریج کو مفسرین نے ترجیح دی ہے۔ اس کے بعد ابن کثیر اور ابن تیمیہ پر تنقید بے فائدہ ہے۔

کھلا ہوا اعراض

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ	پھر اس نے کہا میرے بچو! مصر کے دار السلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا

جمہور مفسرین کے نزدیک (بالاتفاق) اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو نظر (عین) کا اندیشہ ہوا کیونکہ یہ سب لوگ نہایت وجیہ قوی ہیکل تھے اور خاص طور پر بن یامین یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ہم شبیہ تھے یہی حضرت ابن عباس رض محمد بن کعب، مجاہد، ضحاک، قتادہ، سدّی اور متعدد حضرات نے فرمایا ہے اور کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا کیونکہ اس کی تائید میں متعدد صحیح مرفوع احادیث موجود ہیں مثلاً

۱۔ العین حق	نظر کا لگنا حق ہے
۲۔ لو کان شئ سابق القدر سبقته العین	اگر کوئی چیز تقدیر سے سبقت کر سکتی تو وہ نظر ہوتی۔
۳۔ ان العین لتدخل الرجل القبرَ والجمل القدر	نظر آدمی کو قبر میں اور اونٹ کو ہانڈی میں داخل کر دیتی ہے

حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس مرتبہ یہ اندیشہ اس وجہ سے ہوا کہ یہ سب لوگ شاہ مصر کے نزدیک کرم گرد انے گئے تھے بادشاہ نے ان کا اعزاز کیا تھا اور غلہ بھی مفت دیدیا تھا اور مرحبہ مزید یہ ہوا کہ بن یامین بھی ساتھ تھے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ہم شبیہ تھے اس لئے اس مرتبہ حضرت یعقوب کو حضرت یوسف علیہ السلام یاد آگئے اور انکو خدشہ پیدا ہوا وغیرہ ذلک[1]

---

[1] روح المعانی ج۱۳ ص۱۰۔ مظہری ج۵ ص۱۹۱۔ ابن کثیر ج۲ ص۴۸۵۔ بیضاوی ج۳ ص۲۷۵۔ مدارک علی الاکلیل ج۵ ص۴۳

اور نظر کے اس معاملہ کی تائید سورۂ نون کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے

وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ — اور منکر تو لگ ہی رہے ہیں کہ پھسلا دیں تجھکو اپنی نگاہوں سے (شیخ الہند)

لیکن اس جگہ بھی مودودی صاحب اپنے سیاسی مزاج کیوجہ سے بہت دور کی کوڑی لائے ہیں

یہ احتیاطی مشورہ کہ مصر کے دارالسلطنت میں یہ سب بھائی ایک دروازہ سے نہ جائیں ان سیاسی حالات کا تصور کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے جو اس وقت پائے جاتے تھے. یہ لوگ سلطنت مصر کی سرحد پر آزاد قبائلی علاقہ کے رہنے والے تھے اہل مصر اس علاقہ کے لوگوں کو اس شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہونگے جس نگاہ سے ہندوستان کی برطانوی حکومت آزاد سرحدی علاقے والوں کو دیکھتی رہی ہے حضرت یعقوب کو اندیشہ ہوا ہوگا کہ اس قحط کے زمانے میں اگر یہ لوگ ایک جتھا بنے ہوئے وہاں داخل ہوں گے تو شاید انہیں مشتبہ سمجھا جائے اور یہ گمان کیا جائے کہ یہ یہاں لوٹ مار کی غرض سے آئے ہیں پچھلی آیت میں حضرت یعقوب کا یہ ارشاد کہ "اِلَّا یہ کہ تم کہیں گھیر ہی لئے جاؤ" اس مضمون کیطرف خود اشارہ کر رہا ہے کہ یہ مشورہ سیاسی اسباب کی بناء پر تھا۔ فائدہ ۵۲ ص ۴۱۷ - ج ۲

لیکن یہ سیاسی اندیشہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہلی مرتبہ کیوں نہ پیش آیا جب بن یامین کے علاوہ سب بھائی گئے تھے (نعوذ باللہ) کیا حضرت یعقوب علیہ السلام ان سب کا باپ کاٹنا چاہتے تھے کہ اچھا ہے یہ سب ہلاک ہوجائیں اس کے علاوہ مودودی صاحب کے جملے ملاحظہ فرمائیے ایک تاریخی اور سیاسی

تحقیق اور وہ بھی قرآنی آیات کی اور جملے شک والے (ہو گا وغیرہ) لاحول ولا قوۃ الا باللہ رہی ان کے قرینہ کی بات یہ بالکل ایسی ہی ہے "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ"
قرآن شریف کی آیات ملاحظہ ہوں۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ	یعقوب علیہ السلام نے فرمایا میں
حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ	بن یامین کو ہرگز تمہارے ساتھ
اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ	نہ بھیجوں گا حتی کہ تم اللہ کے نام
اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ	کا عہد مجھے نہ دیدو کہ تم اسکو
	میرے پاس ضرور واپس لاؤ گے

مگر یہ کہ کہیں تم سب گھر جاؤ [1]

تو "اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ" اس عہد کے لئے قرینہ ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے لے رہے تھے یہ بات نہیں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ چونکہ ہم آزاد قبائلی ہیں غیر ملک میں جیسے ہی جائینگے ویسے یہ لوگ گرفتار ہو جائینگے۔ اگر یہ بات ہوتی تو وہ پہلی مرتبہ بھی ضرور وصیت کرتے پیغمبر نیک وصیت اپنے دشمنوں کو بھی کرتے ہیں اور یہ تو اولاد تھے پہلی دفعہ وصیت نہ کرنا اور دوسری دفعہ وصیت کرنا ہمارے نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے اور یعقوب علیہ السلام کی بستی کو برطانوی دور کی آزاد قبائلی ریاست قرار دینا کتنا بھونڈا تخیل ہے۔ بس سیاسی اور جغرافیائی بصیرت اسی قدر ہے مصر کی سرحد وہاں تک کہاں تھی جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام تھے جغرافیہ کے نقشہ کو اٹھا کر دیکھئے تو سینکڑوں میل کا فاصلہ نظر آئیگا۔ کچھ نہیں اس جگہ بھی بے سوچے سمجھے مولانا آزاد کی بات اختیار کرلی۔

توراۃ میں ہے کہ یہ صورت اس طرح پیش آئی کہ یوسف نے انہیں جاسوس کہا تھا جب انہوں نے اپنی برئیت میں اپنے گھرانے کے حالات

---

[1] مجاہد نے فرمایا ہے الا یہ کہ تم ہلاک ہو جاؤ مظہری ص ۱۶۹ ج ۵

سنائے تو ان کی بات پکڑ لی اور کہا تم تو کہتے ہو تمہارا ایک بھائی اور ہے اچھا اسے بھی اپنے ساتھ لاؤ تاکہ تمہارے بیان کی تصدیق ہو جائے (تکوین پیدائش ۴۲-۱)

معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر جاسوسی کا شبہ مزید ہو گیا ہوگا اگرچہ خود حضرت یوسف کی طرف سے نہ ہوا ہو اسی لئے حضرت یعقوب جب مجبور ہوئے کہ بن یامین کو ان کے ساتھ بھیجدیں تو نصیحت کی کہ ایک دروازے سے شہر میں نہ داخل ہوں لہ

مولانا آزاد بہر حال آزاد ہیں اور ان کی اڑانے والے بھی اعلیٰ ہیں یہ ان کے خیال میں نہیں کہ پیغمبر اس قسم کی فرضی کارروائی نہیں کیا کرتا قرآن پاک نے صاف کہدیا ہے

فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ	جب یوسف علیہ السلام کے بھائی
وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ	انکے پاس گئے تو حضرت یوسف نے

انکو پہچان لیا اور وہ حضرت یوسف کو نہ پہچان سکے۔

پہچاننے کے بعد کیا یہ کہدیا کہ یہ جاسوس ہیں؟ یہ جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ افسوس کہ اتنی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پیغمبر جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ ایک منسوخ شدہ کتاب (توریت) جس میں بیشتر فرضی قصے ہیں کی تاویل میں اس قدر آگے کہ اپنی صحیح کتاب کو رد کرنے کے درپے ہو جانا، انا للہ وانا الیہ راجعون

بے جوڑ تاویل

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ	اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھا لیا اور وہ اسکے
وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا	آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے ۱۳،۲

مودودی صاحب نے اس جگہ خَرُّوا کا ترجمہ بے اختیار اور سُجَّدًا کا ترجمہ

لہ ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۲۳۷

جھک جانا کیا ہے[ے] اس کی وجہ بھی انہوں نے تشریح ۵ میں بتلادی ہے کہ سجدہ کا مفہوم جو آج کل لیا جاتا ہے وہ مراد نہیں ہے بلکہ سجدہ کے معنی صرف جھک جانے کے ہیں اور اس پر بہت دور تک کلام کیا ہے فرماتے ہیں

> جن لوگوں نے معاملہ کی اس حقیقت کو جانے بغیر اس کی تاویل میں سرسری طور پر لکھدیا ہے کہ اگلی شریعتوں میں غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا یا سجدۂ تحیہ بجالانا جائز تھا انہوں نے محض ایک بے اصل بات کہی ہے اگر سجدہ سے مراد وہ ہے (اسکی تشریح مودودی صاحب نے کردی ہے یعنی جس طرح شرعی اعتبار سے سجدہ کیا جاتا ہے یعنی سر زمین پر ٹیک دینا) تو وہ خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت میں کبھی کسی غیر اللہ کے لیے جائز نہیں رہا [۱]

مودودی صاحب نے اس جگہ سجدۂ تعظیمی اور سجدہ عبادت کے بارے میں بہت دور تک کلام کیا ہے ہم نے بربنائے اختصار مختصراً نقل کیا ہے البتہ خلاصہ دیانتداری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں سجدۂ عبادت اور تعظیمی دونوں ہی ہماری شریعت میں غیر اللہ کے لئے حرام ہیں البتہ سجدۂ تعظیمی حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلی شریعتوں میں تھا [۲] ہم اس جگہ زیادہ باریکیوں میں جانا مناسب نہیں سمجھتے صرف موٹی موٹی چند باتیں ذکر کرتے ہیں

اہل لغت کے نزدیک خرورا کے معنی زمین پر گر پڑتا ہیں [۳] اس کے بعد آیت میں لَہٗ سُجَّدًا ہیں اگر سُجَّدًا کے معنی محض جھک جانے کے ہیں تو خَرُّوْا کے کیا معنی ہونگے؟ اور رکوعاً کے کیا معنی ہونگے۔ اہل لغت اور

---

[۱] تفہیم ج ۲ ص ۴۲۳ فائدہ نمبر ۵ [۲] ہم جس قدر کتابوں کے حوالے دے رہے ہیں سب میں یہی مذکور ہے اور اسی کی تردید مودودی صاحب فرما رہے ہیں [۳] لغات القرآن ج ۲ ص ۹۶ [۴] سورہ اسراء میں جہاں آیت سجدہ ہے وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ کا ترجمہ کیا ہے وہ منھ کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں ص ۴۵۰ ج ۲

تفسیر نے یہی بیان کیا ہے[1] آیت کی ترکیب میں لہٗ لام سببیت کے لئے ہے اس طرح یہ خروا کا مفعول لہٗ ہے اس صورت میں یہ ترجمہ کرنا ہوگا کہ سجدہ تو اصل میں بطورِ شکر یہ اللہ تعالےٰ ہی کو تھا مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ان کی تعظیم کے لئے " یعنی مفسرین نے اس کو سجدۂ شکر قرار دیا ہے جو اللہ تعالےٰ کے لئے تھا نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا سامنے ہونا بالکل ایسے ہی تھا ہے جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں کا سجدہ کرنا

بہرحال اہل تفسیر نے آیت کی ترکیب سے ایک تاویل یہ بھی کی ہے رہی یہ بات کہ سجدۂ تعظیمی دوسری شریعتوں میں تھا اور شریعت محمدی میں منسوخ ہو گیا۔ یہ تاویل مفسرین نے جس بنیاد پر کی ہے اس کے لئے احادیث ہیں۔

۱- حضرت معاذ بن جبل جب ملک شام پہونچے تو انہوں نے دیکھا کہ عیسائی اپنے راہبوں کو سجدہ کرتے ہیں جب وہ واپس آئے تو انہوں نے حضور کو سجدہ کیا آپ نے فرمایا معاذ یہ کیا ہے ؟ عرض کیا میں نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ اپنے راہبوں کو سجدہ کرتے ہیں اور آپ اس کے لئے زیادہ مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر میں کسی کو سجدہ کا امر کرتا تو عورت کو کرتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

۲- حضرت سلمان فارسی رضؓ حضور صؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، (اور یہ ان کے ابتدائے اسلام کی بات ہے) اور حضور صؐ کو سجدہ کیا آپ نے فرمایا سلمان مجھے سجدہ نہ کر بلکہ اللہ تعالےٰ کو سجدہ کر۔

---

[1] مدارک علی الکلیہ ... ۸

ان احادیث سے مفسرین نے استدلال کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی شریعتوں میں سجدۂ تعظیمی تھا جو ہماری شریعت میں منسوخ ہو گیا[۱] مودودی صاحب نے اس کی تردید میں عربی بائبل کی عبارت سے استدلال کیا ہے

فَلَمَّا نَظَرَ رَكَضَ لِاسْتِقْبَالِهِمْ	حضرت ابراہیم ان کے استقبال
مِنْ بَابِ الْخَيْمَةِ وَسَجَدَ	کے لئے دوڑے اور زمین تک
إِلَى الْأَرْضِ	جھکے [۲] ص۴۲ ج ۲

ٹھیک ہے سجدہ کے معنی جھکنے کے بھی ہیں لیکن مفسرین نے مذکورہ آیت کی تاویل میں خَرُّوْا ، سُجَّدًا دونوں الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے اور احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے سجدۂ تعظیمی کو گذشتہ شریعتوں میں جائز قرار دیدیا ہے تو کیا وہ سب غلط فہمی کا شکار ہیں اور بائبل سے استدلال کرکے نہایت خوش فہم !۔ اور ذرا یہ تو بتلایا جائے کہ مفسرین نے سجدۂ تعظیمی کے لئے جو تاویل کی ہے وہ اگر ناپسند ہے تو آنجناب نے سورۂ الحجر میں یہ ترجمہ کیوں کیا ؟

فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ	چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ
أَجْمَعُونَ	کیا [۳]

آنجناب کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ سورۂ بقرہ میں کیا ترجمہ کر آئے ہیں[۳] سچ ہے دوسروں کو زبردستی غلطی کی طرف منسوب کرنے والا آخر کار تضاد کا شکار ہو جاتا ہے

---

[۱] ابن کثیر ص۴۹۱ ج ۲ [۲] تفہیم القرآن ص۵۰۵ ج ۲
[۳] ملاحظہ ہو سورۂ بقر ص۶۴ ج ۱

النحل

قیام ساعۃ | اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ | آگیا اللہ کا فیصلہ اب اس کے لئے جلدی نہ مچاؤ ص۵۲۲

اس کی تشریح میں فرماتے ہیں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ کیا تھا؟ اور کس شکل میں آیا ہم یہ سمجھتے ہیں (اللہ اعلم بالصواب) کہ اس فیصلہ سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت ہے فائدہ ۱ ص پ۲ ج۵۲۲

جناب مودودی صاحب نے "ہم یہ سمجھتے ہیں" کہہ کر اپنی ذمہ داری ٹھالی اور اگر وہ یہ کہدیتے کہ یہ بات میں ترجمان القرآن سے نقل کر رہا ہوں [1] تو ان کی ذمہ داری تقسیم ہو جاتی غالباً ان کے نزدیک یہ کوئی بہت دور کا لکتہ تھا جس کو وہی نکال کر لائے ہیں۔ جلد بازی میں اگلے جملہ پر غور بھی نہیں کیا

فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ اس کی جلدی نہ کرو

(مودودی صاحب اور مولانا آزاد صاحب کے نزدیک) یعنی ہجرت کی جلدی نہ کرو۔ مشرکین مکہ جس چیز کا بار بار مطالبہ کرتے تھے وہ قیامت تھی یا عذاب تھا جس کا قرآن پاک میں بار بار ذکر آیا ہے اور اس ذکر سے مشرکین کو ڈرایا گیا ہے۔ جمہور مفسرین نے یہی بیان کیا ہے [2] اور اس بارے میں حضرت ابن عباس رض کی روایت بھی نقل کر دی ہے قرآن میں بہت جگہ اس کا ذکر ہے

ا۔ اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ قیامت قریب آگئی ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن ص۳۰۵ ج۲ [2] روح المعانی ص۹۰ ج۱۴ مدارک علی الخلیل ص۲۱۱ ج۵ بیضاوی ص۳۰۰ ج۲ ابن کثیر ص۵۶۰ ج۲ مظہری ص۳۲۷ ج۵۔

۲۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ — لوگوں سے ان کا حساب قریب ہوگیا
۳۔ اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ — اللہ کا امر آگیا

اسی قسم کی دوسری آیات کو ملا کر پڑھیے! اور پھر امر اللہ کا مصداق مقرر فرمائیے! اور اسی کے ساتھ مشرکین کی یہ دعا بھی ذہن میں رہنا چاہیے!

۴۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ — اے اللہ! اگر یہ تیرے نزدیک حق ہے تو ہمارے اوپر آسمان سے پتھر برسا دے۔

چنانچہ عذاب کی ادنیٰ سی ایک جھلک ان کو بدر میں دکھلا دی گئی کہ ظاہری اسباب نہ ہونے کے باوجود اہل کفر کی پوری طاقت کو کچل کر رکھ دیا علاوہ ازیں قرب قیامت کے بارے میں بکثرت احادیث بھی موجود ہیں ان کو دیکھ لیا جائے تو امر اللہ کی تفسیر اور واضح ہوجائے گی اور اس سورت کی داخلی شہادت (مودودی صاحب کی اصطلاح میں) بھی یہی ہے کہ امر اللہ سے قیامت یا عذاب الٰہی مراد ہے ہجرت ہرگز نہیں ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل

حقیقت روح

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ — یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں کہو یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے ص ۶۳۹ ج ۲

فائدہ ۱۰۳ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ یہاں روح سے مراد جان ہے یعنی لوگوں

نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روح حیات کے متعلق پوچھا تھا کہ اسکی حقیقت کیا ہے اور اس کا جواب دیا گیا وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے لیکن ہمیں یہ معنی تسلیم کرنے میں سخت تامل ہے (الی قولہ) اب عبارت کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد وحی لانے والا فرشتہ ہی ہو سکتا ہے ص ج ۲
اس کے بعد مودودی صاحب نے بطور دلیل دو آیتوں کا بھی ذکر کیا ہے

۱۔ یُلْقِی الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ	وہ اپنے حکم سے اپنے جس بندے پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کے دن سے آگاہ کردے
۲۔ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ	اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح اپنے حکم سے بھیجی، تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

سلف میں سے ابن عباس، قتادہ اور حسن بصری رحمہم اللہ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے ابن جریر نے اس قول کو قتادہ کے حوالہ سے ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا ہے مگر یہ عجیب بات لکھی ہے کہ ابن عباس اس خیال کو چھپا کر بیان کرتے تھے اور صاحب روح المعانی حسن اور قتادہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ روح سے مراد جبرئیل ہیں، سوال دراصل یہ تھا کہ وہ کیسے نازل ہوتے ہیں اور کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وحی کا القاء ہوتا ہے
ص ج ۲۔

حقیقت حال یہ ہے کہ مودودی صاحب نے روح المعانی میں یہ بات پڑھ لی ہے کہ اس مسئلہ میں علامہ ابن قیم نے اختلاف کیا ہے اور ان کی رائے یہی ہے کہ روح سے مراد وحی لانے والا فرشتہ ہے اور اس پر خوب طویل کلام کیا ہے اور "البحور الذاخرۃ" میں اس کو اکثر سلف کا مسلک قرار دیا ہے اس پر مودودی صاحب نے نہایت جزم کے ساتھ کہدیا اور اس پر غور نہیں کیا کہ صاحب تفسیر روح المعانی نے اسکی تردید کی ہے اور فرمایا ہے:

ما زعمہٗ ابن القیمؒ مروی عن بعض السلف	جو ابن قیم کا گمان ہے وہ بعض سلف سے مروی ہے۔

یعنی تمام اسلاف نے اسکو اختیار نہیں کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ روح سے مراد روح ہے یہ اکثر سلف کا مسلک ہے بلکہ کل کا یہی ارشاد ہے[1] کیونکہ اس بارے میں دوسری آیات بھی ہیں

یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا	جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہونگے۔

اس آیت کی تفسیر میں قتادہ رح نے حضرت ابن عباس رض سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ روح سے مراد بنی آدم ہیں اور یہ وہ بات ہے کہ جسکو ابن عباس رض نے چھپایا تھا[2] یعنی بیان نہیں کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ رائے قتادہ کی ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس رض کے قول پر اضافہ کیا ہے یہ مراد نہیں ہے کہ حضرت ابن عباس رض اسکو چھپائے پھرتے تھے اگر چھپائے پھرتے تھے تو پھر قتادہ ہی سے کیوں ظاہر کردیا بہر حال اس بارے میں دو قول ہیں اور دونوں قول کی تائید میں دلائل ہیں ہمارے نزدیک مولانا آزاد کی رائے معتدل ہے

ترمذی، نسائی اور مسند میں ہے کہ قریش مکہ نے علمائے یہود

---

[1] روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۵۴ [2] مظہری سورۂ نبا جلد ۱۰

ے سنکر یہ سوال کیا تھا کہ روح کیا ہے اس پر یہ آیت اتری ـ
یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ پس
یہاں روح سے مقصود جسم انسانی کی روح ہے یا فرشتہ اس
بارے میں ائمہ تفسیر کی رائیں مختلف ہوئیں لیکن اکثر مفسرین اس
طرف گئے ہیں کہ روح سے مقصود جسم انسانی کی روح ہے[1]
نہ کہ فرشتہ بہر حال سوال دونوں کی نسبت ہو سکتا ہے اور جواب
بھی دونوں کے لئے مطابقت رکھتا ہے[1]

مودودی صاحب نے ترجمہ (روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے) اپنے
مفروضہ کے مطابق کیا ہے وہ عبارت قرآن کے مطابق نہیں کیونکہ کلام میں
الروح مبتدا ہے مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ خبر ہے یعنی روح امر رب سے ہے" یعنی
روح کی کیفیت کیا ہے ـ پس جان لو کہ وہ امر رب ہے " جواب میں
کوئی اشارہ نہیں ہے کہ جس سے امر رب یا اس کی کیفیت کا تشخص کیا
جا سکے اس میں دونوں احتمال ہیں جن کو مفسرین نے بیان کیا ہے انمیں
سے بعض سلف کے قول کو مودودی صاحب نے اختیار کیا ہے اور اکثر اسلاف
بلکہ کل (جمہور) کے مسلک کو علامہ آلوسی نے اختیار کیا ہے ظاہر ہے کہ
اکثر کی بات ہی اقرب الی الصواب ہو سکتی ہے ـ واللہ اعلم بالصواب

---

[1] اصل میں روح المعانی میں یہی بیان کیا ہے جو مولانا آزاد نے نقل کیا ہے

الکہف

سورت کا موضوع

مودودی صاحب نے اس سورت کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔

یہ سورۃ مشرکین مکہ کے تین سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لئے اہل کتاب کے مشورے سے آپ کے سامنے پیش کئے تھے۔ اصحاب کہف کون تھے؟ قصہ خضر کی حقیقت کیا ہے؟ اور ذوالقرنین کا قصہ کیا ہے؟ ص ت ج ۳

اس کے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے،

روایات میں آتا ہے کہ دوسرا سوال روح کے بارے میں تھا جس کا جواب سورۂ بنی اسرائیل کے رکوع ۱۰ میں دیا گیا ہے مگر سورۂ کہف اور بنی اسرائیل کے زمانہ نزول میں کئی سال کا فرق ہے اور سورۂ کہف میں دو کے بجائے تین قصے بیان کئے ہیں اسلئے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرا سوال دراصل قصہ خضر سے متعلق تھا نہ کہ روح کے بارے میں ص ت ج ۳

اور سورۂ کہف کی تفسیری تشریح فائدہ ۶۱ میں لکھتے ہیں۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ کا عطف لامحالہ پچھلے قصہ پر ہے اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے قصہ موسیٰ اور خضر بھی لوگوں کے سوال ہی کے جواب میں سنایا گیا ہے اور یہ بات ہمارے اس قیاس کی تائید کرتی ہے کہ اس سورۃ کے یہ تینوں اہم قصے دراصل کفار مکہ نے اہل کتاب کے مشورہ سے امتحاناً دریافت کئے تھے ص ۴۲ ج ۳

احادیث میں تو ان تین چیزوں کے بارے میں ذکر ہے جو قریش مکہ نے یہودیوں کے مشورے سے کئے تھے یعنی روح، اصحاب الکہف اور ذوالقرنین اور یہی بات قرآن پاک سے بھی ثابت ہے

(۱) يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (۲) اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (۳) يَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ

اصحاب کہف کے قصہ کی ابتدا جس طرح ہے اس سے خود ثابت ہے کہ یہ کسی سوال کا جواب ہے۔ سوال اور طرز جواب سے ظاہر ہے کہ سوال ان ہی تین چیزوں کے بارے میں تھا اور روایات سے بھی یہی ثابت ہے اس سے گریز کر کے قصہ خضر کا اضافہ سوال مشرکین کے جزو کی طرح پیش کر دینا غلط ہے کیونکہ اگر ان روایات کو ضعیف یا کمزور کہہ دیا جائے تو پھر ان آیات ثلاثہ کا کیا جواب ہوگا؟ جبکہ قصہ خضر کی ابتدا، کرنے میں کوئی ایسا قرینہ نہیں ملتا کہ وہ کسی سوال کا جواب ہے حضرت خضر کے قصہ کی ابتدا اس طرح پر ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰهُ (الکہف) اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا۔

آخر قیاس کی یہ بنیاد کہ دونوں قصے متصل ہیں اور سورہ کہف اور سورہ اسریٰ کا زمانہ نزول قریب قریب کا ہے مناسب نہیں ہے اس لئے ہمارے لئے یہ قیاس صرف مودودی صاحب کا تخیل ہے جو ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

کیا یہ وجہ قابل قیاس ہے؟ کہ چونکہ سورت میں دو قصے مشرکین کے سوال کے جواب میں ہیں اس لئے تیسرا قصہ بھی ان کے سوال کا جواب ہے کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ قرآن پاک میں متعدد جگہ کافروں کی رد و کد اور خدا کی طرف سے انکاری سوالی محصل ... سمجھا اور مومنین ... کامرانی ...

کے اوپر بلایا اور مصائب کو ناکافی قرار دیا، اسکے لئے اللہ تعالےٰ نے جہاں ان واقعات کو ذکر کیا ہے وہاں کسی قصہ کے ذریعہ سے ان کو یہ بھی جتلایا ہے کہ یہ تمہاری کامیابی، کامیابی نہیں ہے اور مومنین کی ناکامی، ناکامی نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے اسی طرح یہاں باغ والوں کی مثال دی اور اس کے بعد دوسری مثال قصہ موسیٰ اور خضر ہے، اس قصہ سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ کسی چیز کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور حقیقت کچھ اور ہوتی ہے چنانچہ مودودی صاحب نے خود ہی تحریر کیا ہے

اس مرحلے پر قصہ سنانے سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ ظاہر بین نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کرلیتی ہے الخ ص۳۲ ج ۳

مودودی صاحب نے اس مفہوم کو چوتھائی صفحہ میں پھیلا دیا ہے جبکہ مولانا آزاد نے صرف ایک دو سطر میں لکھ دیا ہے

سرکشوں کے لئے اسوقت کامرانیاں ہیں مومنوں کے لئے محرومیاں لیکن کیا فی الحقیقت سرکشوں کی کامرانیاں کامرانیاں ہیں اور مومنوں کی محرومیاں محرومیاں ہیں اس کا تم فیصلہ نہیں کرسکتے جب پردہ اٹھے گا تم دیکھ لوگے کہ حقیقتِ حال کیا ہے الخ ص۳۸۷ ج ۲

بات اتنی سی ہے حسب پر اپنی طرف سے قیاس گھڑ لیا کہ مشرکین نے اس کا بھی سوال کرلیا تھا، سیدھی بات دبی ہے جو آخر میں کہی ہے پہلے جو کچھ بیان کیا ہے بلادلیل ہے اور غلط ہے

حقیقتِ خضر علیہ السلام

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً

اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے

مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا — نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔

اوپر گذر چکا ہے کہ اس بندۂ خدا کا نام خضر تھا ایسا ہی صحیحین میں روایت کیا ہے جس کو سعید بن جبیر رضؓ نے روایت کیا ہے۔ اور حافظ ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے

هذا هو الخضر علیه السلام — یہ صاحب حضرت خضر علیہ السلام
کما دلت علیه الاحادیث — ہیں جیسا کہ اس پر احادیث
الصحیحة (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۹۳) — صحیحہ دلالت کرتی ہیں

ان ذات گرامی کے بارے میں مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے

پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ وہاں انہوں نے ایک مرد کو پایا حضرت خضر کے انسان ہونے پر صریح دلالت نہیں کرتا اس کے بعد ہمارے لئے اس پیچیدگی کو رفع کرنے کے لئے صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم خضر کو انسان نہ مانیں بلکہ فرشتوں میں سے یا اللہ کی کسی اور مخلوق میں سے سمجھیں جو شرائع کی مکلف نہیں ہے بلکہ کارگاہ مشیت کی کارکن ہے متقدمین میں سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے جسے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ماوردی کے حوالہ سے نقل کیا ہے ص۴۲ ج ۲ فائدہ ۶۰

اور بات یہیں تک نہیں ہے بلکہ اپنے قیاس کو مضبوط کرنے کے لئے انہوں نے آیات سے بھی استدلال کیا ہے مثلاً

۱۔ مذکورہ بالا آیت کی تشریح میں فرمایا ہے "ظاہر ہے کہ اس سے بندے کے انسان ہونے کو مستلزم نہیں ہے قرآن شریف میں متعدد جگہ فرشتوں کے لئے بھی یہ لفظ (عبد) استعمال ہوا ہے

۲۔ مذکورہ حدیث (حضرت سعید بن جبیر رضؓ والی) جسمیں حضرت خضر کے لئے رجل کا لفظ آیا ہے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ بھی انسانوں

کے لئے مخصوص نہیں فرماتے ہیں کہ یہ لفظ جنوں کے لئے بھی مستعمل
ہوچکا ہے وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ
مِّنَ الْجِنِّ

ان کے دلائل کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت خضر انسان نہیں تھے بلکہ کچھ اور تھے
خواہ فرشتہ ہوں، یا اور کچھ ہوں کیونکہ ان سے تین منکرات کا صادر ہوا. (۱)
کشتی کا توڑ دینا، (۲) دیوار کو سیدھا کر دینا (۳) لڑکے کو قتل کر دینا یہ کھلے
ہوئے منکرات تھے (تفصیل ملاحظہ ہو ص۴۲ ج ۳ فائدہ نمبر ۶۰)

ان اشکالات کو رفع کرنے کے لئے ان کے نزدیک یہی مناسب معلوم ہوا
کہ حضرت خضر علیہ السلام کو سرے سے انسان ہی نہ تسلیم کریں بلکہ فرشتہ یا اور
کوئی مخلوق۔ فرماتے ہیں

ظاہر یہ ہے کہ یہ تشریعی احکام نہ تھے کیونکہ شرائع الٰہیہ کے جو بنیادی
اصول ہیں قرآن اور اس سے پہلے کتب آسمانی سے ثابت ہے انہیں
کبھی کسی انسان کے لئے یہ گنجائش نہیں رکھی گئی کہ بلا ثبوت جرم کسی
دوسرے انسان کو قتل کر دے اس لئے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ احکام
اپنی نوعیت میں اللہ تعالٰے کے ان تکوینی احکام سے مشابہت رکھتے
ہیں جن کے تحت دنیا میں ہر آن کوئی بیمار ڈالا جاتا ہے ا ھ۔

ص۴۲ ج ۳ فائدہ نمبر ۶۰

اگر مودودی صاحب امور تکوینیہ کو واقعی تسلیم کرتے ہیں تو اشکال باقی ہی نہیں رہتا
جب ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ اللہ تعالٰے نے ہاروت وماروت (دو فرشتوں)
کو انسانوں کی آزمائش کے لئے آدمیوں کی شکل میں متشکل کر دیا کہ وہ انسانوں
کو سحر جیسی حرام چیز کی تعلیم دیا کرتے تھے تو اس میں کونسی پیچیدگی پیدا کر دی کہ حضرت
خضر علیہ السلام کوئی نبی تھے یا ولی تھے (غرضکہ انسان تھے) ان کو یہ امر فرما دیا ہو
کہ ایسا ایسا کریں تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی معلوم ہو جائے کہ اس کارگاہ عالم

میں خدا کی حکمتوں پر کما حقہ واقفیت پانا کسی انسان کے قبضہ سے باہر ہے الّا یہ کہ اللہ تعالےٰ چاہے

اگر حضرت خضر علیہ السلام انسان نہیں بلکہ فرشتہ تھے تو پھر انہوں نے کھانا کیوں طلب کیا؟

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ	جب دونوں ایک بستی میں پہونچے
اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا	تو وہاں کے باشندوں سے کھانا مانگا

کیا فرشتوں کو کھانے کی ضرورت تھی؟ کیا خواہ مخواہ لوگوں کو مجرم گرداننے کے لئے کھانا مانگا تھا؟ بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو اس کھانا طلبی میں حضرت موسےٰ علیہ السلام بھی تو شریک ہیں کیونکہ تثنیہ کا صیغہ ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس سوال میں صرف حضرت موسیٰ اور جوان داخل ہیں تو گزارش یہ ہے کہ پورے معاملہ میں برابر حضرت موسیٰ ہی سے سوال ہے جوان تو ہر جگہ خاموش ہے۔ محترم مودودی صاحب! براہِ کرم اگر جمہور امت ہی کی بات کو تسلیم کرلیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ نہ بنائیں تو اس سے کچھ بگڑ تو جائیگا نہیں۔ جمہور کا فیصلہ یہ ہے

وَالصحیح انہ نبی جزم	صحیح یہ ہے کہ خضر علیہ السلام نبی ہیں
بہ جماعۃ وقال	اور اسی پر ایک جماعت نے جزم کیا
الثعلبی ھو نبی علی جمیع	ہے اور ثعلبی کا قول ہے کہ وہ تمام
الاقوال (الی قولہ) وجزم	کے نزدیک نبی ہیں اور اسی پر
بہ ابن الجوزی فی کتابہ[1]	ابن جوزی نے اپنی کتاب میں
واغرب ما قیل انہ	جزم دکھایا ہے اور سب سے
من الملائکۃ[2]	غریب قول یہ ہے کہ وہ فرشتہ ہیں

ابن جوزی جیسا آدمی جو ذرا ذرا سی بات پر جرح کرتا ہے اور بعض دفعہ قوی تر

---

[1] حاشیہ بخاری از عینی ص ۲۰ ج ۱ [2] ایضاً

اور صحیح حدیث کو بھی ضعیف کہہ جاتا ہے جس کی تنقید سے اچھے اچھے گھبراتے ہیں وہ بھی جزم کے ساتھ کہدے کہ حضرت خضر صرف انسان بلکہ نبی تھے یہ بات زیادہ وزنی ہے یا مودودی صاحب کی کہ جس کو متقدمین نے سب سے زیادہ غریب قول کہدیا ہے۔ اور وہ حدیث[1] جس کا حوالہ مودودی صاحب نے دیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

اذ جاءہ رجل فقال تعلم مکان رجل اعلم منک[1]	ایک آدمی آیا اور اس نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کیا آپ اس آدمی کی جگہ جانتے ہیں جو آپ سے زیادہ عالم ہیں

اس حدیث میں کوئی قرینہ ہے کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ رجل سے مراد غیر انسان ہے بخلاف ان کے مستدل (دونوں آیتوں) کے وہ انسانی رجل کے مقابلہ صراحۃً جن کا لفظ مذکور ہے آخر یہ قرینہ کی کونسی قسم ہے استدلال کے لئے کوئی تو وجہ ہونا چاہیئے۔ اس کو بھی رہنے دیجئے قرآن پاک کے کلمات پر ہی نظر کیجئے تو معلوم ہو جائے گا ان میں سے ایک قرینہ تو ہم نے ذکر کر دیا ہے کہ دونوں نے کھانا طلب کیا اور فرشتوں کو کھانے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا شروع قصہ کی آیات میں یہ ہے

۱ــــ وَآتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا۔	ہم نے اسکو رحمت عطا[2] کی تھی اور اسکو اپنے پاس سے علم عطا کیا تھا۔
۲ــــ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ	موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں کہ

[1] تفسیر ابن کثیر صـ۹۴ ج ۳ [2] معترضین نے اس جگہ رحمت سے مراد وحی اور نبوت لی ہے مظہری صـ۵۰ ج ۶ اگر یہ مراد ہو تو اگلے فقرہ میں علم کا تذکرہ موجود ہے معلوم ہوا کہ رحمت سے مراد علم کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے اور اسکو نبوت قرار دیا ہے

رُشدًا ۔ آپ مجھے اسمیں سے سکھا دیں
جس رشد کی آپ کو تعلیم کی گئی ہے ۔

آیت میں علّمنا ہی کے اوپر بات کو ختم نہیں کیا بلکہ مزید فرمایا ہم نے اپنے پاس سے علم سکھایا اللہ تعالے براہ راست جس کو علم سکھائے وہ کیا چیز ہوتی ہو معلوم ہوا کہ یہاں کہ نفس (علم)معلومات سے اگلی کوئی شئے دیگر مراد ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو عُلِّمْتَ رُشْدًا کہہ کر ان تمام شکوک کو دور کر دیا جن شکوک کو مودودی صاحب نے پیش کیا ہے راغب امام لغت نے فرمایا ہے

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ رَشَدٌ ، رُشْد سے اخص ہے کیونکہ رُشد امور دینیہ اور اخرویہ دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور رَشَد امور اخرویہ میں بولا جاتا ہے لہ

اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ رُشد کا لفظ اس علم اور صلاحیت کو ظاہر کرتا ہو جو نفس علم سے بڑھ کر ہے اسی علم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سیکھنے گئے تھے لہ

ذوالقرنین اس قصہ میں مودودی صاحب نے اپنے خیال کے مطابق جدید تحقیق پیش کی ہے لیکن جن لوگوں نے مولانا آزاد کی ترجمان القرآن کو پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مودودی صاحب نے مولانا آزاد کی تحقیق جو انہوں نے تفصیل کے ساتھ ۲۶×۲۰ سائز سطرہ ۲ کے ۳۱ صفحات اس پر صرف کئے ہیں اور مودودی صاحب نے اس کا خلاصہ نقل کر دیا ہے اور مولانا آزاد کا نام تک نہیں لیا ہے صرف جلد ۲ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا آزاد کی

لہ لغات القرآن ص۲۰۶ ج ۲ لہ مودودی صاحب کی اس کتاب میں یہ کمال ہے کہ اسلامی لٹریچر کا اولاً تو حوالہ ہی نہیں دیتے تفہیم القرآن کی دو جلد ختم ہو چکی ہیں اس میں ماسٹہ فائدہ ص۲۰ پہلا مقام ہے جہاں روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۶ تا ۱۸ پہلا حوالہ ہے اس سے قبل ایک جگہ اتنا لکھا ہے صاحب روح المعانی نے لکھا ہے اور بس ۔

تحقیق بھی یہی ہے اس سے یہ پتہ چل گیا کہ مودودی صاحب نے ترجمان القرآن از مولانا آزاد سے بھی استفادہ کیا ہے اسلئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ذوالقرنین کی تحقیق ترجمان القرآن میں نہ پڑھی ہو جب یہ حقیقت ہے تو ان کے لئے لازم نہیں کہ اس کی تحقیق کا سہرا اپنے سر پر باندھ لیں اس موقعہ پر محقق اول کا حق ہے۔

سورۂ طٰہٰ

شرف ہم کلامی

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ (الیٰ قولہ تعالیٰ) وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ

اور اے موسیٰ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ (الیٰ قولہ) اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں

آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

۱۔ پوچھنے سے مقصود یہ تھا کہ لاٹھی کا لاٹھی ہونا حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں اچھی طرح مستحضر ہو جائے فائدہ ۱۱ ص ۔ ۹۰

۲۔ مگر حضرت موسیٰ نے اس سوال کا جو لمبا جواب دیا وہ ان کی اس وقت کی قلبی کیفیت کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتا ہے قاعدہ کی بات ہے کہ جب آدمی کو کسی بڑی شخصیت سے بات کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو وہ اپنی بات کو طویل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ دیر تک اس کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل رہے۔ فائدہ ۱۲

لہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اے موسیٰ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے یمین داہنے ہاتھ کو کہتے ہیں جو ترجمہ مودودی صاحب نے کیا ہے اس کیلئے یہ عبارت ہونا چاہیئے تھی وَمَا تِلْكَ بِيَدِكَ يَا مُوسَىٰ۔

یہ دو نکتے مودودی صاحب نے علامہ آلوسی کی تفسیر سے اخذ کئے ہیں اور اپنے بنا کر پیش کر دئے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے دیباچہ تفسیر میں یہی فرمایا ہے (ملاحظہ فرمائیے اصول ۱۳) علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر میں اور متعدد نکتے بھی بیان کئے ہیں مثلاً۔

کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہاں اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھا تو رعب اور دہشت طاری ہو گئی ان پر سے یہ دحشت دور کرنے اور مانوس کرنے کے لئے یہ کلام شروع کیا گیا۔ اس کے علاوہ مذکورہ دونوں نکتے اور متعدد فوائد بیان کئے گئے ہیں[1]

مودودی صاحب اگر حوالہ دیتے تو یہ ان کی علمی شان کے عین مناسب تھا کیونکہ اسلامیات میں جس بات کو حوالوں اور دوسروں کے اقوال کی تائید حاصل ہو جائے وہ بات اتنی ہی پختہ سمجھی جاتی ہے مودودی صاحب نے اسی سورت میں دوسرے موقع پر تفسیر روح المعانی کا بقید صفحات حوالہ دیا ہے اس کا جائزہ اسی جگہ لیا جائے گا۔ لیکن اس جگہ علامہ آلوسی کی بات کو اپنی بنا کر پیش کیا ہے اور یہ علمی سرقہ ہے۔

متفرقات

۱۔ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے

اس جگہ بھی مودودی صاحب نے روح المعانی سے ایک نکتہ نقل کیا اور وہی تنقید کی ہے جو علامہ آلوسی نے کی ہے۔ قصہ یہ ہے (جس کو تلمود نے بھی ذکر کیا ہے) کہ بچپن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ سے اٹھا کر منہ میں انگارا رکھ لیا تھا اس کی وجہ سے زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی فرماتے ہیں:۔

لیکن عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اسلئے کہ اگر بچپنے میں آگ

---

[1] روح المعانی ص۱۷۲ ج ۱۶

پہلا تھ مارا بھی ہو تو یہ کس طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ انگارے کو اٹھا کر منہ میں لے جا سکے ا۔ص ۹۲ ج ۳

علامہ آلوسی نے بھی یہی تنقید کی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے

وَكُلُّ ذٰلِكَ بِتَقْدِيرِ اللهِ لِيَقْضِيَ اللهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا	یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تقدیر (حکم) سے ہو سکتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ہونے والی بات کو کر کے دکھلائے۔

ہم تلمود کی روایت کی تصدیق نہیں کرتے لیکن اس کو اس بنا پر ممکن جانتے ہیں کہ کسی پیغمبر میں پیدائشی طور پر کوئی جسمانی عیب کبھی ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا ہے اگرچہ حادثاتی امور ان میں سے بعض میں پیدا ہوئے ہیں مثلاً حضرت یعقوب علیہ السلام عارضی طور پر چند دنوں کے لئے نابینا ہو گئے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکنت میں کیا کیا حکمت الہٰی مضمر تھیں ان میں سے بعض کو اہل تفسیر نے بیان کیا ہے ۔ ؎

۲۔ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ	اور یاد کر اس وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا ہے ص ۹۳ ج ۳

مودودی صاحب کے ترجمہ کو دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ترجمہ بالکل غلط کیا ہے قرآن پاک کی عبارت میں ما یوحیٰ ہے اور ترجمہ کما یوحیٰ کا معلوم ہوتا ہے یعنی ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ ہی کیا جاتا ہے " اس طرح ترجمہ کے کوئی معنی نہیں ہیں کیونکہ اگلی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ کیا وحی کی گئی تھی حضرت شیخ الہند رح نے اسی رعایت سے ترجمہ کیا ہے

؎ روح المعانی ص ۱۸۲ ج ۱۶ ؎ ایضاً ص ۱۸۳ ج ۱۶

پھر حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو جو آگے سناتے ہیں
یعنی مایوحیٰ جو وحی کی گئی وہ کیا تھی

اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ کہ ڈال اسکو صندوق میں

اَنْ اس جگہ تفسیر کر رہا ہے کہ مایوحیٰ کیا ہے" بالفرض جو ترجمہ مودودی صاحب نے کیا ہے اسکو صاحب تفسیر روح المعانی نے بھی رد کیا ہے اس جگہ یہ شک ہو سکتا ہے کہ غیر نبی کو وحی سے کیا مراد ہے؟ تو یہاں وحی سے مراد الہام ہے یعنی اسوقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو الہام کیا گیا (خواہ بصورت خواب ہو یا دل میں یہ بات ڈال دی گئی ہو کہ ایسا کرنا چاہیئے) اور وحی الہام کے معنی میں قرآن پاک میں متعدد جگہ مستعمل ہے

ا وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ تیرے رب نے شہد کی مکھیوں کو الہام کیا۔

ب۔ وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا

علامہ آلوسی نے فرمایا ہے یہ ویسا ہی الہام تھا جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کو آپ کے نام کے بارے میں کیا گیا تھا کہ محمد رکھنا۔ ان سے جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو جواب دیا "وانہ سیحمد" ان کی تعریف کی جائے گی [۲]

بہر حال وحی کا ترجمہ اشارہ مناسب نہیں ہے

فرعون کی سیاسی ربوبیت

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی فرعون نے کہا اچھا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے۔ اے موسیٰ۔ ص۹۲ ج ۳

---

[۱] یہ اَنْ تفسیری ہے روح المعانی ص۱۸۵ ج ۱۶ ابن عطیہ نے کہا ہے یہ اَنْ مصدریہ ہے لیکن با محذوف ہے اسطرح یہ ماقبل کا بدل ہے۔ ایضاً [۲] روح المعانی ص۱۸۶ ج ۱۶

اس آیت کی تشریح فائدہ ۲۱ میں تفصیل سے بیان کی ہے اور استدلال میں آیات کو بھی پیش کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعون منکر خدا نہیں تھا تحریر فرماتے ہیں :-

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرعون اپنی قوم کا واحد معبود تھا وہاں اس کے سوا کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی ۔ یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ فرعون خود سورج دیوتا (رع یا راع) کے اوتار کی حیثیت سے بادشاہی کا استحقاق جتاتا تھا اور یہ بات بھی مصر کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش ہوتی تھی ۔ اسلئے فرعون کا دعویٰ واحد مرکز پرستش ہونے کا نہ تھا بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریے کے اعتبار سے دراصل پوری نوع انسانی کی سیاسی ربوبیت خداوندی کا مدعی تھا [لہ] ۔ اور یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرماں روا ہو جس کا نمائندہ آکر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے ۔ بعض لوگوں کو اس کی لن ترانیوں سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر تھا اھ فائدہ ۲۱ ص ۹۶

۹۷ ج ۳

قبل اس کے کہ ہم نفس موضوع پر بحث کریں (یعنی فرعون کی سیاسی ربوبیت اور اس کا خدا کی ہستی کا منکر ہونا وغیرہ) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کے چند جملوں کی طرف توجہ دلا دیں ۔

۱ــ اسلئے فرعون کا دعویٰ واحد مرکز پرستش کا نہ تھا ۔

لہ جملوں کی اضافت، لغات کا استعمال، جملوں کی ساخت عبارت کا زیر و بم ملاحظہ کیجئے معلوم نہیں یہ شخص ادبی چیستانیں گھڑ رہا ہے یا قرآنی حقائق پر گفتگو کر رہا ہے ۔

۲۔ دراصل پوری نوع انسانی کی سیاسی ربوبیت خداوندی کا مدعی تھا۔ لہ

۳۔ اور وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرماں روا ہو کہ جس کا نمائندہ آکر اسے ایک حکم دے۔ الخ

۴۔ یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر تھا۔ لہ

ہم نمرود کی سیاسی ربوبیت کے بارے میں گذشتہ سطور میں مختصراً عرض کر آئے وہاں دوبارہ نظر ڈال لی جائے۔ معلوم نہیں۔ مودودی صاحب اس مسئلہ میں (کہ فرعون منکرِ خدا نہیں تھا بلکہ وہ نوعِ انسانی کی سیاسی ربوبیت خداوندی کا مدعی تھا (لہ) فرعون کی نمائندگی کر کے اور قرآنی آیات کو اس کی وکالت کرتے ہوئے پیش کرنے سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں؟ ان ہی کے الفاظ میں اگر وہ منکر نہیں تھا تو کیا تھا؟ اور اس سے کیا حاصل ہو گیا؟ کیا اس مردود کی آخرت سدھر گئی یا وہ ہلاک ہونے سے بچ گیا، کیا اس کو رسوائی نصیب نہیں ہوئی کیا وہ دوزخ میں نہیں جائے گا" مودودی صاحب نے اس مردود کے لئے جو یہ تنکے اکٹھا کر دئے ہیں اس سے اس کو کچھ سہارا مل جائیگا اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو کیا ہمیں یہ شک کرنے کی اجازت ہے کہ گذشتہ برسوں میں جو اہلِ مصر نے نعرہ بلند کیا تھا

نحن آل فرعون   ہم فرعون کی اولاد ہیں۔

اس کی کوئی باعزت شرح کی جا رہی ہو؟ مودودی صاحب نے فرعونی زمانے کی تاریخی شہادتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآنی آیات کو بھی استعمال کیا

لہ جملہ ۳ اور جملہ ۴ کو پڑھیئے! اور فیصلہ کیجئے! ایک طرف تو اپنے اوپر دوسری ہستی کا منکر ہو رہا ہے کہ کوئی اس کا نمائندہ آکر اسے کوئی حکم دے اور جملہ ۴ میں ہے کہ وہ خدا کی ہستی کا منکر نہ تھا یہ کیا تماشہ ہے؟ بلوغ عقل کی حالت میں ایسی عبارت دیکھی گئی ہے یا یہ شعور کی حالت ہیں؟ ۲ اس جملہ کی ادبی ساخت بھلا اتنی بھونڈی ہے کہ الجھن پیدا ہوتی ہے۔

ہے کہ فلاں فلاں آیات سے ثابت ہے کہ وہ منکر خدا نہ تھا مثلاً سورۂ والنازعات، سورۂ زخرف میں آیت ۵۲، سورہ قصص، سورۂ شعراء وغیرہ قرآن پاک کی ان آیات کو ہم نے ان کے فرمانے کے بموجب پڑھا اور پڑھ کر اب ہم یہ کہتے ہیں کہ فرعون نے رب موسیٰ کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ کیا استہزا نہیں ہوسکتا؟ ہاں صاحب تبلائیے آپ کا رب کون ہے یعنی میرے سوا بھی کوئی ہوسکتا ہے یا فرعون نے اپنے وزیر سے کہا اگر موسیٰ کا خدا موجود ہے تو چلو اس سے جنگ کریں ذرا بلند منارے تو تعمیر کراؤ! اور اسی قسم کے دوسرے جملے۔ کیا وہ اس قسم کی دلیلیں سکتے ہیں فرعون خدا کو مان کر یہ سب کچھ کر رہا تھا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کھلے ٹھٹھا کر رہا تھا^{لہ}، ناظرین کرام سے التماس ہے کہ وہ قرآن پاک میں مذکورہ سورتوں کی آیات یا اس کے ترجمے کو پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ مودودی صاحب اپنی رائے میں کہاں تک حق بجانب ہیں صرف دو آیتوں کو اس جگہ بھی پڑھیں۔

۱۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى — میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں

کیا سیاسی ربوبیت کے اعتبار سے؟

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ — جب وہ غرق ہونے لگا تو بولا
قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ — میں ایمان لایا کہ اس کے سوا
اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ — کوئی معبود نہیں کہ جس پر
بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ — بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں اور
الْمُسْلِمِیْنَ — اب میں مسلمان ہوتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ غرق ہونے سے پہلے پوری زندگی میں اس مردود نے اللہ تعالیٰ

لہ یہ بات لطف سے خالی نہ ہوگی کہ سورہ یوسف میں "ربی احسن مثوای" میں رب کے لفظ سے یہ فائدہ اٹھایا کہ وہاں تو رب حقیقی مراد لیا اور یہاں رب سے یعنی "انا ربکم الاعلیٰ" سے مراد سیاسی ربوبیت مراد لے لی۔ واہ وا، واہ

کی الوہیت کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا اور مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ منکر خدا نہ تھا۔ مودودی صاحب کی ان تاویلات اور ادبی چیستانوں پر ان ہی کے الفاظ میں ہم یہاں تبصرہ کرتے ہیں جو انہوں نے آئندہ صفحہ پر (سامری کے قصہ کے تحت دوسروں پر کیا ہے۔

لیکن یہ حضرات (بشمول مودودی صاحب) اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ قرآن معموں اور پہیلیوں کی زبان میں نازل نہیں ہوا ہے بلکہ عام فہم "عربی مبین" میں نازل ہوا ہے جسکو ایک عام عرب اپنی زبان کے معروف محاورے کے مطابق سمجھ سکے (تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۱۹)

اس لئے اب ہم یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ دونوں آیات سے یہ واضح ہے کہ فرعون صرف سیاسی ربوبیت خداوندی ہی کا مدعی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے کو رب اعلیٰ کہتا تھا، کافر، منکر، مردود تھا، عبارت قرآن سے تو یہی ثابت ہے اور ایک عام عربی داں پڑھ کر اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے۔

قصہ سامری کا

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ	موسیٰ نے کہا سامری تیرا کیا معاملہ
يَا سَامِرِيُّ	ہے اس نے جواب دیا میں نے وہ چیز
قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا	دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی پس
بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِنْ	میں نے رسول کے نقش قدم سے
أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا	ایک مٹھی اٹھالی اور اسکو ڈالدیا
وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي	میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا ہے (ج ۳ ص ۱۱۹)

قرآن پاک میں یہ قصہ اس وقت کا بیان کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے تھے ان کے پیچھے ان کی قوم نے گوسالہ پرستی شروع کردی تھی اس کے لئے سامری نے ان سے زیورات لیکر ایک بچھڑا ڈھال دیا تھا جس سے آواز نکلا کرتی تھی سامری نے کہا تھا یہی تمہارا رب ہے اور یہی موسیٰ کا رب ہے الخ۔ اس آیت کی تفسیر تمام متقدمین حضرات صحابہ رضی

اور تابعین رح نے یہ کی ہے

جب حضرت جبرئیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور واپس آسمان پر تشریف لے گئے اس وقت سامری نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے پیر کے نیچے کی مٹی اٹھالی [۱]، کم و بیش اسی قسم کے الفاظ کے ساتھ یہ روایت ہے بعض میں گھوڑے کا ذکر ہے اور بعض میں نہیں ہے اسی تفسیر کو مجاہد، قتادہ، حسن، ابو عمارہ، سدّی وغیرہ نے اختیار کیا ہے

اسی بنا پر صاحب تفسیر روح المعانی نے فرمایا ہے:

یہی تفسیر صحابہ رضؓ اور تابعین رح اور تبع تابعین رح اور اجلاء مفسرین سے منقول ہے [۲]

ان آثار کی بنا پر یہی قول مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اور دیگر تمام مفسرین نے اختیار کیا ہے لیکن ابو مسلم اصفہانی اور امام فخر الدین رازی نے اور انہیں سے (غالباً) مولانا ابو الکلام آزاد نے اختیار کیا ہے مولانا آزاد نے تحریر کیا ہے

جب حضرت موسیٰ نے سامری سے پوچھا تو دین حق سے کیوں پھر گیا تو اس نے کہا میں نے اللہ کے رسول کی (یعنی آپ کی) ایک حد تک پیروی کی کیونکہ جو بات میری قوم کے دوسرے آدمی نہ پاسکے تھے میں نے پالی تھی مگر میں نے آپ کا طریقہ چھوڑ دیا۔ میری طبیعت کے بے اختیارانہ ولولے نے مجھے اس کے لئے مجبور کر دیا تھا کیونکہ میرا

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ص۱۶۲ ج ۳

[۲] روح المعانی ص۲۵۴ ج ۲

آبائی طریقۂ عبادت یہی ہے [عہ] (ترجمان القرآن ص ۱۵۹ ج ۲)

اس پر صاحب تفسیر روح المعانی نے سخت تنقید کی ہے اور مودودی صاحب کے تنقیدی الفاظ کو بعینہٖ ہم گزشتہ سطور میں نقل کر آئے ہیں، مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ متقدمین حضرات نے جو تفسیر کی ہے اور جو تفسیر جدید مفسرین نے کی ہے وہ ظاہر قرآن سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ ظاہر قرآن سے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے

اس طرز فکر کو چھوڑ کر جو شخص بھی اس سلسلہ کلام میں اس آیت کو پڑھے گا وہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لیگا کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا جس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک زبردست مکر و فریب کی اسکیم تیار رکھی تھی اس نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی اور ساری قوم کے جاہل نادان لوگوں کو دھوکہ میں ڈال دیا مگر اس پر مزید جسارت بھی کی کہ خود حضرت موسیٰ کے سامنے ایک پر فریب داستان گھڑ کر رکھ دی اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا اور ساتھ ساتھ یہ بھی افسانہ گھڑ دیا کہ رسول کے نقش قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبرئیل ہی ہوں (جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے رسول کا

عہ یہ تفسیر فخر الدین رازی کی تفسیر سے ماخوذ ہے اسی کو مولانا آزاد نے لیا ہے اور اسی کو عبد اللہ عمادی رکن جامع عثمانیہ حیدرآباد دکن نے بھی لیا ہے۔ اس کی تردید مودودی صاحب نے بھی کی ہے اور سب سے زیادہ بلیغ تردید صاحب روح المعانی نے کی ہے ہم نے عبد اللہ عمادی کا رسالہ المحکمات پڑھا ہے اس میں اور بھی جدید باتیں ہیں۔

لفظ خود حضرت موسیٰ کے لئے استعمال کیا تھا[1] تو یہ اس کی ایک اور مکاری تھی وہ اس طرح حضرت موسیٰ کو ایک ذہنی رشوت دینا چاہتا تھا (الی قولہ) قرآن اس سارے معاملہ کو سامری کے ایک فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اپنی طرف سے بطور واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قباحت لازم آتی ہو صـ ۱۲۰ ج ۳۔ فائدہ ۷۳

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے یعنی نقبضت قبضۃ الخ یہ سامری کا قول ہے واقعہ ایسا نہیں تھا۔ یہ اس نے جھوٹ بنا کر کہدیا۔ ہم مولانا آزاد کی تفسیر سے بالکل متفق نہیں ہیں اور نہ امام ابو مسلم اصفہانی اور نہ امام رازی کی ان پر کافی تنقید علامہ آلوسی نے کردی ہے اور وہ بہت کافی ہے۔ علامہ آلوسی نے متقدمین کی تفسیر کی تصدیق کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ "لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا" اس جگہ قرآن پاک کی ان متفرق آیات کو پیش کیا جا رہا ہے جس سے نفس واقعہ اور بنی اسرائیل کا مشرکانہ فکر و عمل معلوم ہوگا۔

۱۔ قَالَ فَاِنَّا فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ	اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کی آزمائش کی اور انکو سامری نے گمراہ کر دیا۔
۲۔ فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ فَاَخْرَجَ لَهٗ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَا اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ	پس ایسے ہی ڈالدیا سامری نے پس بنا دیا اس سے بچھڑے کا ایک جسم کہ اسکی بیل کی سی آواز تھی (بنی اسرائیل بولے) یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے پس موسیٰ اسکو بھول گیا

[1] ایک روایت میں علامہ آلوسی نے رسول سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لکھا ہے۔

یاد رہے سامری اس خاندان سے تھا جس میں گائے پرستی ہوتی تھی وہ بنی اسرائیل کی عادت سے واقف تھا بنی اسرائیل نے اسی سفر پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کر چکے تھے

۳۔ قَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ — بولے اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی خدا مقرر کر دے جیسا کہ ان کا خدا ہے

۴۔ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ — اور ان کے دلوں میں بچھڑے کو پلا دیا گیا تھا [1]

جب یہ بات تھی تو سامری نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بنی اسرائیل کے لئے ان کے مزاج کے مطابق معبود گھڑ کے کھڑا کر دیا تاکہ اس کو اس فتنہ پردازی اور سانگ میں بالادستی حاصل رہے اور وہ قوم کا بلا شرکتِ غیر مہا پرش ہو جائے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا کرم فرمایا جیسا کہ فَتَنَّا قَوْمَكَ میں اشارہ ہے کہ سامری کے منہ سے ہی حقیقت ظاہر کرا دی اور اس نے اعتراف کر لیا کہ یہ کرشمہ خاکِ قدمِ رسول سے ظاہر ہوا ہے۔ اس میں یہ بھی نکتہ ہے کہ سامری کی کرتوت سے کچھ نہیں ہوا بلکہ رسول کے قدم (خواہ وہ جبرئیل ہوں یا حضرت موسیٰ) کی خاک سے ہوا ہے" اس سے مزید دو فائدے ظاہر ہوتے ہیں ایک یہ کہ بنی اسرائیل کے دلوں سے سامری کی شخصیت گر جائے اور وہ سمجھ لیں کہ برکت کیا تھی اور اس نے سمجھا یا کیا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ سامری کو اپنی بریئت کے لئے ایک دلیل ہاتھ آ گئی وہ یہ کہ میں تو صرف بچھڑا بنانے کا گنہگار ہوں اس کے بعد باقی کرشمہ یہ میرا نہیں ہے بلکہ یہ خاک قدم رسول کا کرشمہ ہے۔ اس لئے یہ کیا بعید ہے کہ بنی اسرائیل کے مزاج میں جو بت پرستی رچ بس گئی تھی

لہ یعنی وہ گائے پرستی میں اتنے آگے بڑھے ہوئے تھے کہ گئو پرستش انکی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی

ان پر مزید ایک حجت یہ قائم کر دی گئی کہ انہوں نے اس چیز کو معبود بنا لیا جس کو سامری نے ان ہی کے سامنے گھڑا تھا اس طرح ان پر دفعہ جرم مکمل ہو گئی اور ان پر قتل نفس کی سزا مقرر کی گئی یہ سب باتیں ظاہر عبارت قرآن پاک سے سمجھ میں آتی ہیں جس کو ایک معمولی عربی داں بھی آسانی سے سمجھ جائیگا۔

متفرقات يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ یہ لوگ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں

فائدہ ۸۲ کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:

یہ بھی جملہ معترضہ ہے جو دوران تقریر میں کسی سامع کے سوال پر ارشاد ہوا ہے ص۱۲۳ ج ۳

مودودی صاحب نے یہ بات قلت تدبر کی بنا پر کہدی ان کی عبارت سے یہ مترشح ہو رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجمع کفار میں قیامت کے موضوع پر تقریر فرما رہے تھے اس پر کسی نے سوال کیا کہ پہاڑوں کا کیا ہوگا تو جواب دیا کہ میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دیگا محترم! یہ ضروری نہیں ہے کہ دوران تقریر کسی نے سوال کیا بلکہ مشرکین کو جو قیامت کے بارے میں شبہات ہوتے رہتے تھے اور وہ وقتاً فوقتاً پیش کرتے تھے ان کے سوالات کے جوابات اور ان کے عقائد کی تردید دوسرے وقت آیات اور سورتیں اتار کر کر دی جاتی تھی قرآن پاک کلام الہٰی ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر نہیں ہے کہ دوران تقریر کسی نے سوال کھڑا کر دیا اور پھر آپ نے اس کا یہ جواب دیا اس لئے جناب مودودی صاحب کی یہ تعبیر مناسب نہیں ہے اس قسم کے جملے قرآن پاک میں دوسری جگہ بھی ہیں کیا وہ سب دوران تقریر کے سوال ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہے یہ جناب مودودی صاحب کی فہم کا

تصور ہے۔

۱۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ — آپ سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں

۲۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ — آپ سے ہلال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں

۳۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ — آپ سے شہر حرام کے بارے میں دریافت کرتے ہیں

۴۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ — آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

ان کا مقتضا یہ نہیں ہے کہ آپ کوئی تقریر فرما رہے تھے اور اس پر سوال کر لیا اور اس پر آپ نے یہ جواب دیا اس طرح یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کا ربط یہ ہے۔ خدائی کلام جس طرح نازل ہوا ہے اور آیات کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضور ؐ نے سورتوں میں لکھا دیا ہے آیت کبھی نازل ہوئی تھی اور لکھا یا کسی دوسری سورت میں ہے "خواہ مخواہ کا ربط دینے کے لئے آپ ایسی کوشش کرتے ہیں کہ جس سے عوام تو عوام متوسط درجہ کے لوگوں کو بھی شبہ ہونے لگے کہ (نعوذ باللہ) قرآن پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر ہے۔ محترم! آپ اپنے دیباچوں میں جگہ جگہ یہ لکھتے آرہے ہیں کہ اس سورت میں اتنی تقریریں ہے یا اتنے خطبے ہیں۔ آخر ان جملوں کی دلالت کیا ہے اور آپ نے تو غضب کر دیا کہ سورۃ کے مضامین مشتمل بر حالات قیامت کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا ہے

"یہ سورت ایک الہامی تقریر کے انداز میں سنائی جارہی ہوگی"

صفحہ ۱۲۲ ج ۳

اس عبارت پر غور کیا جائے کیا قرآن پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی الہامی تقریر ہے؟ "انداز میں سنائی جارہی ہوگی" یہ خواہ مخواہ ... اس میں مزید یہ جملہ

زور قلم غلط فائدہ اٹھاتا ہے

خلافت آدم | سورہ طہ کے آخر میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ آیا ہے اس جگہ خلافت آدم علیہ السلام پر کلام کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :-

اس جگہ حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ختم ہو جاتا ہے یہ قصہ جس طریقے سے یہاں اور قرآن کے دوسرے مقامات پر بیان ہوا ہے اس پر غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں (واللہ اعلم بالصواب) کہ زمین کی اصل خلافت وہی تھی جو آدم علیہ السلام کو ابتداءً جنت میں دی گئی تھی وہ جنت ممکن ہے کہ آسمانوں میں ہو اور ممکن ہے کہ اسی زمین پر بنائی گئی ہو ص۱۳۲ ج ۳ - فائدہ ۱۰۶

اس جگہ ہمیں دو اعتبار سے کلام ہے خلافت آدم کے بارے میں شروع سورۂ بقرہ میں ہے

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا	میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں فرشتے بولے کیا آپ زمین میں اسکو مقرر کرینگے جو اس پر فساد پھیلائے گا۔

یہ بات اللہ تعالیٰ نے پیدائش آدم علیہ السلام سے قبل فرمائی تھی اور فرائض خلافت انکو زمین پر اتارنے کے بعد تفویض کیے گئے، تو وہ خلیفہ زمین پر اترنے کے بعد ہوئے یا زمین پر اترنے سے پہلے تھے؟ ظاہر قرآن سے کیا بات سمجھ میں آتی ہے " رہی دوسری بات کہ جنت ممکن ہے آسمانوں میں ہو اور ممکن ہے زمین پر ہو؟ تو حدیث معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کہاں جا کر دیکھی؟ اس حدیث کے بعد کیا فرمایا جائیگا؟ اور قرآن پاک کی آیت بھی ملاحظہ فرمائیے!

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى — اور دیکھا اسکو دوسرے اترنے
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى — کے وقت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس
عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (النجم) اسکے پاس جنت الماویٰ ہے

سدرۃ المنتہیٰ کیا زمین پر ہے کہ جس کے قریب جنت الماویٰ ہے اس آیت کے بعد ٹمن کا اشتطا بولنا مودودی صاحب کے لکھنے میں تھکاوٹ یا اڑنگا ظاہر کرتا ہے

الانبیاء

ترجمان القرآن سے مشابہت

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ — اور جب پکارا حضرت ایوبؑ نے
اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ — اپنے رب کو (الہٰی) مجھے بیماری لگ
اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ — گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے

اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:-

دعا کا انداز کس قدر لطیف ہے مختصر ترین الفاظ میں اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد بس یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں تو ارحم الراحمین ہے آگے کوئی شکوہ شکایت نہیں کوئی عرض مدعا نہیں، کسی چیز کا مطالبہ نہیں اس طرز دعا میں کچھ ایسی شان آتی ہے جیسے کوئی انتہائی صابر و قانع اور شریف و خوددار آدمی ہے۔ پے در پے فاقوں سے بیتاب ہو اور کسی کریم النفس ہستی کے سامنے بس اتنا کہہ کر رہ جائے میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں آگے اسکی زبان سے کچھ نہ نکل سکے فائدے ۱۷۶ ج ۳

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے

اگر ایک فقیر بادشاہ سے کہے میں محتاج ہوں اور تجھ سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں تو پھر اس کے بعد اور کیا رہ گیا جو اس نے نہیں کہا اور کیوں اس سے اس کی زبان سے کچھ نکلے۔ ترجمان القرآن ص۴۹۷ ج۲

اس سے پہلے تحریر فرماتے ہیں:۔

انی مسنی الضر میں اُن کے درد مصیبت کی پوری داستان آگئی کوئی گوشہ بھی نہیں چھوٹا ساتھ ہی اسلوب خطاب یہ ہوا کہ میں دکھ میں پڑگیا ہوں ص۴۸۹ ج۲

حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں مولانا آزاد نے لکھا ہے:

جب حضرت داؤد علیہ السلام حمد الہٰی کے گیت گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا اور چٹانیں تک وجد میں آجاتی تھیں روایات تفسیر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ص۴۸۰ ج۲

مولانا مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں

حضرت داؤد جب اللہ کی حمد وثنا کے گیت گاتے تھے تو انکی بلند اور سریلی آواز سے پہاڑ گونج اٹھتے تھے

اس معنی کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے الخ تفہیم القرآن ص۱۷۱ ج۳ فائدہ ۱۷

وراثتِ ارض

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ	اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے اور اس میں عبادت گزار لوگوں کے لئے ایک بڑی خبر

ہم اس جگہ مودودی صاحب کی تشریحات پر کوئی تنقید و تبصرہ نہیں کرتے بلکہ اس جگہ صرف اس قدر تبلانا چاہتے ہیں اللہ تعالےٰ نے وراثت ارض صالحین کے لئے مخصوص کی ہے

آیت پاک میں (یرثہا کی جگہ) یملکہا کا صیغہ بھی استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن صرف وراثت کا صیغہ استعمال کیا ہے وجہ غالباً اس کی یہ ہے کہ وراثت (مال موروثی) اس ترکہ کا نام ہے جو حق قرابت کی وجہ سے میت کے رشتہ دار کو متوفی کے بعد پہونچتا ہے یہ حق اللہ تعالےٰ کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے اس میں نہ وارث کے کسب و عمل کو دخل ہے اور نہ متوفی کے محروم کرنے سے وہ محروم ہوتا ہے یہ وہ حق ہے جو بلا طلب اور بلا جد و جہد اللہ تعالےٰ کی طرف سے مرنے والے وارث کو پہونچتا ہے بالفاظ دیگر یہ انعام خداوندی ہے اگر ملکیت کا لفظ اس جگہ استعمال کیا جاتا تو یہ صورت نہ ہوتی کیونکہ ملکیت کے طریقے متعدد ہیں اس کے لیۓ آدمی کو کسب و عمل کی بھی ضرورت پڑتی ہے وراثت کے لئے یہ سب کچھ نہیں ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وراثت ارض اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک و صالح لوگوں کے لئے مخصوص ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی پوری جد و جہد اور دعوت صرف صالح معاشرہ قائم کرنے اور اعمال صالحہ کے زندہ کرنے پر صرف ہوئی ہے، اعمال صالحہ کا زندہ ہونا اور ان اعمال پر معاشرہ کا قائم ہوجانا اس کا لازمی نتیجہ وراثت ارض ہے (گویا قدرتی طور پر اعمال صالحہ میں مقناطیسی کشش ہے) جس سے وراثت ارض کھنچ کر مومنین کے پاس آجاتی ہے اس کے لئے کسی جد و جہد کی ضرورت نہیں ہے اگر ضرورت ہے تو صرف اعمال صالحہ کے زندہ کرنے کی ضرورت ہے

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اللہ تعالیٰ کا مومنین اور عمل صالح
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	کرنے والوں کے لئے وعدہ ہے کہ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ	ان کو ضرور خلیفہ فی الارض بنادیا جائیگا

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ	جیسا کہ ان سے پہلوں کو بنایا گیا
قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	ہے اور ان کے لئے ان کے اس
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى	دین کو جو ان کے لیے پسند
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ	کر لیا گیا ہے مضبوط کر دیا جائے
بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا	گا اور ان کے خوف کو امن سے
	بدل دیا جائیگا۔

آیت میں انتہائی تاکیدی الفاظ کے ساتھ بات کہی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وعدہ خداوندی کے خلاف ہرگز نہ ہوگا۔

۱۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ کے طریقہ میں ہرگز
تَبْدِيْلًا	تبدیلی نہ ہوگی۔
۲۔ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا	اس میں عابدین کے لئے ایک
لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ	بڑا زبردست خبر ہے

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور وارثین انبیاء اور مومنین کی کوشش اور پوری محنت اعمال صالحہ کے زندہ کرنے اور قائم کرنے پر ہونا چاہیئے حصول مملکت اور حکومت کے لئے ان کو چنداں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے وہ خالص عطائے ربانی اور انعام خداوندی ہے حکومت الٰہیہ کیا ہے؟ اس کا تعارف آج تک نہ مودودی صاحب نے کرایا اور نہ جماعت اسلامی نے۔ البتہ ہم نے گذشتہ بیس سال کی درمیانی مدت میں یہ ضرور محسوس کیا ہے کہ یہ حضرات جب اس فلسفہ کی خامی پر آگاہ ہوئے تو اس کی جگہ اقامت دین کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا لیکن اس کا مفہوم اور معنی وہی باقی رکھے جو حکومت الٰہیہ کے ان کے نزدیک تھے۔

انبیاء رسالتین کے نزدیک دعوت دین اور قیام دین کے مقابلہ میں اگر حکومت کوئی باوقعت چیز ہوتی تو مودودی صاحب کے الفاظ ہی کی روشنی

میں جیساکہ وہ نمرود اور فرعون کے بارے میں بیان کر چکے ہیں) کفر کے ان سرغنوں کو اپنے پروپیگنڈے میں کامیاب ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے والے حضرات نے جب یہ دیکھ لیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تمام تر کوششیں حصولِ اقتدار کے لئے نہیں بلکہ دین اللہ کے قائم کرنے کے بارے میں ہیں تو وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی نصرت اور اتباع میں مضبوط اور مستقیم ہو گئے۔

انبیاء سابقین میں صرف تین انبیاء علیہم السلام تو ایسے ہیں جنہوں نے دعوت دین اور اقامت دین کے ساتھ کار حکمرانی بھی انجام دئے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، اور حضرت سلیمان علیہ السلام لیکن ان کے علاوہ دیگر انبیاء سابقین نے اقامتِ دین تو کی ہے کار حکمرانی انجام نہیں دئے تو کیا وہ سب اپنے مشن میں ناکام رہے؟ ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہوا

سورۃ الحج

زمانۂ نزول اس سورۃ کے زمانہ نزول کے بارے میں تحریر فرمایا ہے اس سورت میں مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات ملی جلی پائی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے مفسرین میں اس امر پر اختلاف ہوا ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کے مضامین اور انداز بیان کا یہ رنگ اس وجہ سے ہے کہ اس کا ایک حصہ مکی دور کے آخر میں اور دوسرا مدنی دور کے آغاز میں نازل ہوا ہے اسی وجہ سے دونوں ادوار کی خصوصیات اس میں جمع ہو گئی ہیں ملاحظہ ۱۹۱ ج ۳

اس جگہ مودودی صاحب نے زمانہ نزول کے بارے میں تحقیق کا انتساب

اپنی ہی طرف کیا ہے حالانکہ تفسیر روح المعانی ان کے زیر مطالعہ ہے اور اب تک تین جگہ وہ اس کا ذکر کر چکے۔ علامہ سید محمود آلوسی نے اس بارے میں اختلاف کو نقل کرنے کے بعد اپنی رائے جو ان کے نزدیک فیصلہ کن ہے یہی تحریر فرمائی ہے اور اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے۔

والاصح القول بانها	سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ
مختلطة فیها مدنی و	چونکہ اس میں مکی و مدنی (قسم کے
مکی وان اختلف فی التعیین	مضامین) کا اختلاط ہے اگرچہ
وھو قول الجمھور	تعیین میں اختلاف ہے (کہ کس
	قدر حصہ مدنی ہے اور کس قدر مکی ہے) یہی جمہور کا قول ہے[1]

اس جگہ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن میں یہ بھی تضاد ہے کہ شروع میں لکھا ہے "سورۃ الحج مدنیۃ" حالانکہ اہل تفسیر نے اس اختلاف کو ملحوظ رکھا ہے اور لکھا ہے:-

سورۃ الحج بعضھا مدنیۃ	سورۂ حج کی بعض آیات مدنی
واکثرھا مکیۃ[2]	ہیں اور اکثر مکی ہیں۔

روایت پرستی

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ	اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی
مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ الخ	

اس آیت کی تشریح میں سورۃ النجم کے واقعہ کو ذکر کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ پہونچے

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى	بھلا تم دیکھو تو لات اور عزی کو
وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى	اور مناۃ تیسرے آخر والے کو۔

تو اس جگہ شیطانی کرشمہ سازی کی وجہ سے (غالبًا) کسی کے منہ سے یہ آواز نکل گئی

[1] روح المعانی ص ۱۱۰ ج ۱۷ [2] تفسیر مظہری ص ۲۵۰ ج ۶

تلک الغرانیق العلی وشفاعتھن لترتجی

یہ بلند پایہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے
اس جگہ بعض راویوں نے اس کو روایت کر دیا ہے کہ (خدانخواستہ) یہ آواز حضور کی زبان مبارک سے نکلی تھی۔ اہل حدیث اور ناقدین اور مفسرین نے اس پر سخت تنقید کی ہے اور اکثر نے اس کو رد کر دیا ہے۔ اس روایت کو سامنے رکھتے ہوئے مودودی صاحب نے ایک جگہ ان الفاظ میں تنقید کی ہے :-

ہم اس کا ذکر یہاں اس لئے کرتے ہیں کہ قرآن کے طالب علم فہم قرآن میں روایات سے مدد لینے کے لئے صحیح اور غلط طریقوں کا فرق اچھی طرح سمجھ سکیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ روایت پرستی اور ناروا غلو کیا نتائج پیدا کرتا ہے ص۲۳۹ ج ۳ فائدہ ۱۰۱

اسی قسم کے الفاظ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں بخاری و مسلم کی حدیث (ثلاث کذبات والی روایت) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھے ہیں

ایک گروہ روایت پرستی کے معاملہ میں غلو کر کے اس حد تک پہونچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پرواہ نہیں کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے ص۱۶۹ ج۳ فائدہ ۶۰

اس جگہ مولانا آزاد نے بھی تبصرہ کیا ہے ان کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیے !

باقی رہی صحیحین کی روایت کہ لم یکذب ابراہیم فی شئ قط الا ثلاث کلھن فی اللہ الخ تو اگرچہ اس کی توجیہ اور تاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھول لی ہیں مگر صاف بات وہی ہے جو امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب ہے اور جسے امام رازی نے بھی دہرایا ہے یعنی ہمارے لئے یہ تسلیم کر لینا آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر

حدیث میں غلطی ہوگئی بہ مقابلہ اس کے ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کرلیں لہ

تبصرہ وہی ہے جو مودودی صاحب نے کیا ہے لیکن دونوں تبصروں کی سنجیدگی میں فرق ہے۔ اب رہی صحیحین کی روایت والی بات (ثلاث کذبات) جس پر مولانا آزاد اور مودودی صاحب نے یک قلم بزن لوٹ دیا ہے یہ دراصل ان کے قلت تفکر و تدبر کی دلیل ہے یہاں کذب کو جھوٹ کے معنی میں مراد نہیں لیا جا سکتا اور اس کی مثال ہمارے سامنے ابھی تفہیم القرآن میں سورۂ الشعراء کے ترجمہ میں مل جاتی ہے اس جگہ ذنب اور ضلال کو ان کے معنی معروف (گناہ اور گمراہی) میں مراد نہیں لیا ہے۔

۱۔ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ — مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے صفحہ ۸۲ج۳

قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ — اُس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا صفحہ ۸۲ ج۳

ان دونوں جگہ متکلم اور مخاطب کی حیثیت کا اعتبار کرتے ہوئے جو تاویل کی گئی ہے اسی طرح حدیث میں حضرت ابراہیم ؑ کی حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے کذب کو تعریض پر محمول کیا جائیگا مذکورہ دونوں آیتوں میں ذنب اور ضلال کو اپنے اصلی معنی معروف پر محمول نہیں کیا گیا بلکہ قرینہ کی وجہ سے معنی مجازی یا دیگر معنی مراد لئے ہیں تو حدیث شریف کے معنی تعریض پر محمول کرنے سے کیا قباحت لازم آتی ہے؟

النور

ایک تمہید سورۃ النور میں جناب مودودی صاحب نے احکامات حجاب پر نہایت تفصیلی کلام کیا ہے اور خوب کیا ہے لیکن اس سورت میں بعض مقامات ایسے ہیں کہ جنکو انہوں نے سرسری طور پر پڑھا اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی اس بنا پر وہ تنقید کر گئے ہیں اور جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا جتنی سمجھ پائے تھے بس اسی کی صحت پر ان کو اصرار ہوگیا ان بعض مقامات میں سے ایک یہ بھی ہے۔

وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا

اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اسکے جو خود ظاہر ہو جائے ۲۸۵ ج ۳

اس آیت کی تشریح میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

۱۔ اس آیت کے مفہوم کو تفسیروں کے مختلف بیانات نے اچھا خاصا مبہم بنادیا ہے ورنہ بجائے خود بات بالکل صاف ہے پہلے فقرہ میں ارشاد ہوا ہے "لایبدین زینتھن" وہ اپنی آرائش اور زیبائش کو ظاہر نہ کریں اور دوسرے فقرے الّا بول کر اس حکم نہی سے مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ ہے "ماظہر منہا" جو کچھ اس آرائش اور زیبائش میں سے ظاہر ہو یا ظاہر ہو جائے

۲۔ اس کے برعکس بعض مفسرین نے "ماظہر منہا" کا مطلب لیا ہے مایظہر الانسان علی العادۃ الجاریۃ۔ جسے عادۃً انسان ظاہر کرتا ہے اور پھر وہ اس میں منہ اور ہاتھوں کو ان کی تمام آرائشوں سمیت شامل کر دیتے ہیں۔

۳۔ جو یہ مطلب ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگردوں سے مروی ہے اور فقہاء حنفیہ کے ایک اچھے خاصے گروہ نے اسے قبول کیا ہے

فائدہ ۳۵ ص ۲۸۶ ج ۳

اس جگہ اولاً مختصر تمہید عرض ہے وہ یہ کہ کسی آیت کی تفسیر اور اس آیت سے ماخوذ احکامات یہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اگرچہ مأول الیہ کے اعتبار سے آیت سے ماخوذ احکامات بھی تفسیر کہلاتے ہیں احکامات کا جہاں تک تعلق ہے وہ صرف ظاہر عبارت قرآن پر موقوف نہیں ہیں بلکہ آیت کا اقتضاء، آیت کی دلالت، آیت کے اشارہ سے بھی اس کا تعلق ہے مثلاً

لَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ — ماں باپ کو اف بھی نہ کرو

ظاہر عبارت سے تو صرف اُف کی ممانعت ہے لیکن تقاضاء محل کلام یہ ہے کہ ہر اس چیز کی ممانعت ہے جس سے ماں باپ کو اذیت ہو مذکورہ آیت کے ترجمہ میں ماظہر ماضی کا صیغہ ہے اس سے مایظہر (مضارع) مراد لیا جائے (جیسا کہ مودودی صاحب نے تشریح میں اختیار کیا ہے لیکن دوسرے سانس میں اس کی تردید بھی کی ہے) کسی دلالت اور اقتضاء کے اعتبار سے ہی مراد ہو سکتا ہے

دوسری بات اس آیت میں زینت کے معنی کو ظاہر کرنا ہیں کہ اس سے مراد کیا ہے؟ ابن بکر نے کہا ہے

الزینہ تقع علی محاسن	زینت کا اطلاق محاسن خلقی (جسم)
الخلق التی خلق اللہ تعالٰی	جو اللہ تعالٰی نے پیدا کئے ہیں پر
وعلی ما یتزین بہ من فضل	اور اس چیز پر بھی ہوتا ہے جس
لباس والمراد فی الاٰیۃ	سے زینت اختیار کی جاتی ہے
النھی عن ابداء ذلک لہ	(اچھے لباس) اور آیت میں مراد

ا۔ روح المعانی ص ۱۴۲ ج ۱۸

اس کے ظاہر کرنے کی ممانعت ہے

امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں بیان کیا ہے

ان المراد بالزینة ما یعم الخلقة وغیرها[1]	زینت سے مراد عام ہے اس میں خلقت (جسم) اور غیر جسم (لباس وغیرہ) سب داخل ہیں۔

زینت کے یہ معنی مراد لینے کے لئے امام رازی نے مندرجہ آیت سے استدلال کیا ہے

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ	اور ڈالے رہیں اپنی اوڑھنیوں کو اپنے سینوں پر

اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں برہنہ سینہ (پستانوں) کا ظاہر کرنا ناجائز ہے وہاں سینہ پر کپڑا ڈال کر سینہ کو ظاہر کرنا بھی ممنوع ہے اس تشریح کے بعد مذکورہ بالا آیت کا مطلب یہ ہوگا

اور نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو مگر وہ حصہ جو ظاہر ہے

اور اگلی آیت میں اس کی مزید صراحت ہے آیت میں اِلَّا حرف استثنار خود اس پر دلالت کررہا ہے کہ زینت خواہ وہ از قسم لباس ہو یا خلقت (چہرہ وغیرہ) اس کو بلا ضرورت ظاہر نہ کیا جائے حضرت ابن مسعود رضؓ نے فرمایا ہے

المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان (ترمذی)	عورت کل کی کل عورت ہے (قابل ستر و حجاب) ہے جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اسکو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

یعنی عورت کا وجود از سر تا پا زینت اور جاذب نظر ہے اس کلیہ میں قدرةً استثنائی حکم ہونا ضروری ہے اور وہ کیا ہے کہ جسکو ضرورت کے وقت ظاہر

[1] تفسیر کبیر ص ۲۰۶ ج ۳

کیا جا سکتا ہے وہ ہے چہرہ اور دونوں ہاتھ اور دونوں پیر اس میں اختلاف ہے کہ ہاتھ سے مراد کتنا حصہ ہے اور قدم سے مراد کتنا حصہ ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں

ایک دن اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ حاضر ہوئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں حضور نے ان سے اعراض فرمایا اور ارشاد فرمایا اسماء عورت جب بالغ ہو جائے تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) بجز ان دو حصوں کے (بجز ضرورت کے وقت) ظاہر کرنے کی اجازت نہیں لے

بہر حال اگر زینت سے مراد یہ لیا جائے جو مودودی صاحب نے فرمایا کہ صرف لباس اس میں داخل ہے) اگر وہ لباس از خود کسی وقت کھل جائے تو اس کی اجازت ہے منھ اور چہرہ داخل نہیں ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر ایسی ضرورت پیش آجائے مثلاً علاج کے وقت یا عدالت کو شبہ ہو جائے تو پھر کیا حکم ہے ؟ آیت کے اندر جب کہ دونوں احتمال ہیں اور احادیث نے ان دونوں کی شرح بھی کر دی ہے تو پھر ابہام کس چیز میں باقی رہ گیا ؟ ان تشریحات کے بعد مودودی صاحب کے ابتدائی الفاظ کتنے غیر ضروری اور غیر ذمہ دارانہ ہیں وہ ناظرین پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

ایک ادبی تحقیق

اَوْ نِسَآئِهِنَّ اپنے میل جول کی عورتیں صفحہ ۳۸۲ ج ۳

پردہ کے بیان میں قرآن پاک میں ذکر ہے کہ مسلمان عورت اپنی زینت کو کن کن پر ظاہر کر سکتی ہے اس میں ایک لفظ اوپر درج ہے جس کا ترجمہ مودودی صاحب نے "اپنے میل جول کی عورتیں کیا ہے۔ اس کی تشریح فائدہ ۴۳ ج ۳ میں اس طرح فرماتے ہیں

۱۔ اصل میں لفظ "نسائهن" استعمال ہوا ہے لفظی ترجمہ ہے ان کی

لے تفسیر ابن کثیر از ابوداود ۲۸۳ ج ۳

عورتیں :" ان سے کون عورتیں مراد ہیں۔ یہ بحث تو بعد کی ہے سب سے پہلے جو بات قابل غور اور قابل توجہ ہے یہ ہے کہ محض عورتوں "النساء" استعمال نہیں کیا گیا ہے مسلمان عورت کے لئے تمام عورتوں اور ہر قسم کی عورتوں کے سامنے بے پردہ ہونا اور اظہار زینت کرنا جائز ہو جاتا۔

۲۔ تیسری رائے یہ ہے اور یہی معقول بھی ہے اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر بھی کہ اس سے دراصل ان کے میل جول کی عورتیں ان کی جانی بوجھی عورتیں، ان سے تعلقات رکھنے والی عورتیں اور ان کے کام کاج والی عورتیں مراد ہیں[لہ] خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم

ص۳۹۰ ج ۳۔ فائدہ ۳۲

یہ تیسری رائے جسکو معقول قرار دیا ہے اور جس کو قرآن کے الفاظ سے قریب تر قرار دیا ہے یہی نامعقول اور قرآن کے الفاظ سے بعید تر ہے اسلئے کہ قاعدہ ہے کہ اگر نکرہ کی اضافت معرفہ کی طرف ہو جائے تو اس میں تخصیص پیدا ہو جاتی ہے مثلاً غلام زید، غلام رجل یعنی زید کا غلام نہ کہ کسی اور کا غلام، مرد کا غلام نہ کہ عورت کا غلام۔ عربی میں ضمیروں کو معرفہ ہی شمار کیا ہے اگر کہا جائے "غلامھن" تو مراد ہو گا عورتوں کا غلام۔ اس طرح سے نسائھن ہے اب قرآن پاک کو ملاحظہ فرمائیں

قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ مومنہ عورتوں سے فرما دیجئے

پورا کلام اسی پر عطف ہو رہا ہے تو ھُنَّ کی ضمیر مومنات کی طرف راجع ہو

[لہ] تحریر اور جملوں پر نظر رکھیں! بات پہلے جملے میل جول پر ختم ہو گئی ہے اس کے بعد جملے محض بات کو گڈمڈ کرنے کے لئے ہیں عبارت صرف اتنی کافی ہے ان کے میل جول کی عورتیں خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ مودودی صاحب جانتے ہیں کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں اسوجہ سے زیادہ جملے استعمال کر ڈالے۔

جس سے صاف مطلب نکل آیا کہ نسائہن سے مراد صرف مومنہ عورتیں ہیں اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ میل جول کی غیر مسلمہ عورتیں بھی اسمیں داخل ہیں۔ علامہ آلوسی نے بیان فرمایا ہے

المختصات بهن بالصحبة	عورتوں کے ساتھ مختص صرف
والخدمة من حرائر	وہ عورتیں ہیں جو مومنہ ہوں
المومنات فان الكوافر	جن کے ساتھ صحبت اور خدمت
لا يتحرجن ان يصفن	رہتی ہو۔ کافرہ عورتیں مردوں
للرجال	کے سامنے ان کے اوصاف بیان
	کرنے سے نہیں جھجکتیں [1]

علامہ آلوسی نے اسی کو اکثر اسلاف کا مذہب قرار دیا ہے حدیث شریف میں مذکور ہے ؛۔

عورت، عورت کے ساتھ اس درجہ نہ کھلے کہ اگر وہ اسکے اوصاف کو اس طرح بیان کر دے کہ گویا اس کا شوہر اس کو دیکھ رہا ہے (بخاری و مسلم)

اور یہ ظاہر ہے کہ مومنہ عورت تو اس کی احتیاط کرے گی لیکن کافرہ عورت عام طور پر اس معاملہ میں بے جھجک ہوتی ہیں وہ پردہ کی نزاکت سے کیا واقف ؟ اور حضرت عمر رضؓ نے حضرت ابو عبیدہ رضؓ کی طرف جو مکتوب لکھا تھا اس میں اس کی صاف صراحت ہے

لا يحل لامراة تومن بالله	اس عورت کے لئے حلال نہیں کہ
واليوم الآخر ان ينظر الى	نظر کرے اسکے ستر کی طرف کوئی
عورتها الا اهل ملتها [2]	دوسری عورت مگر اسکی ملت ہی
	کی (یعنی مسلمان)

[1] روح المعانی ص۱۴۳ ج۱۸، [2] تفسیر ابن کثیر ص۲۸۴ ج ۳

اور مجاہد نے بیان کیا ہے کہ نسائہن سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں کافر عورتیں نہیں ہیں اس لئے میل جول کی عورتوں کے ساتھ مومنہ کی قید ضروری ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ

ا۔ مودودی صاحب نسائہن کی ضمیر کے مرجع سے قطعاً واقف نہیں اس وجہ سے نسائہن کا ترجمہ کرنے میں ان سے غلطی ہوئی ہے

ب۔ اسی غلطی کی وجہ سے انہوں نے میل جول کی عورتوں میں کافرہ عورتوں کو بھی داخل کر لیا۔ حالانکہ قرآن پاک میں ضمیر کا مرجع مومنات ہے جس کی وجہ سے میل جول کی مومنہ عورتیں مراد ہیں نہ کہ کافرہ عورتیں۔

الفرقان

رحمٰن کیا ہے	وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ	جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اس رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمان کیا ہوتا ہے صفحہ ۴۶۱ ج ۳

اس کی تشریح فائدہ ۲۳ میں فرماتے ہیں

علاوہ بریں یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ عرب میں اللہ تعالیٰ کے لئے قدیم زمانے سے رحمٰن کا لفظ معروف اور مستعمل نہ تھا

یہ درست ہے کہ مشرکین نے یہ الفاظ "رحمٰن کیا ہے؟" استہزاءً اور طغیان جاہلیت کی بنا پر کہے تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قریش مکہ اللہ کے لئے رحمٰن کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، چنانچہ معاہدہ حدیبیہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے شروع میں لکھایا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو قریش

لہ تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۲۰ ج ۳

نے انکار کر دیا تھا

فقالوا لا نعرف الرحمٰن	بولے ہم رحمٰن اور رحیم کو نہیں جانتے
ولا الرحیم ولکن اکتب	آپ تو ویسا ہی لکھیں جیسا کہ
کما کنت تکتب باسمک	لکھا کرتے تھے باسمک اللّٰھم
اللّٰھم	

یعنی قریش مکہ میں دستور اور رواج ہی یہ تھا کہ وہ اللہ کو رحمٰن اور رحیم کے نام سے نہیں پکارتے تھے رہا دیگر قبائل کا معاملہ (یمامہ) وغیرہ تو وہاں یہ مستعمل تھا قریش نے جو اس جگہ انکار کیا یہ انکار سرکشی اور طغیانی کی وجہ سے تو تھا ہی لیکن تھا یہی انکار جیسا کہ معاہدہ حدیبیہ کے موقع پر تھا علامہ سید محمود آلوسی نے تحریر فرمایا ہے

ما کانوا یطلقونه علی اللّٰه تعالیٰ[2]	قریش اللہ کے لیے رحمٰن کا لفظ استعمال نہ کرتے تھے

بلکہ رحمٰن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بعض دوسرے قبائل استعمال کرتے تھے جیسا کہ مسیلمہ کذاب کیلئے رحمٰن یمامہ کا لفظ بولا جاتا تھا قریش مکہ کی اسی ذہنیت کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اور قرآن پاک کی دوسری سورتوں میں لفظ رحمٰن، رحیم کو ذکر فرمایا، جیسا کہ سورہ حٰم السجدہ کے شروع میں بھی

حٰم تنزیل من الرحمٰن الرحیم	اتارا ہوا ہے رحمٰن اور رحیم کی جانب سے

بعض سورتوں میں " تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ اور تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ بھی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خراب ذہنیت کی اصلاح کی ہے اور ان کے غلط دستور کو ختم کیا ہے جیسا کہ حج کے لئے قریش کا طریقہ تھا کہ وہ عرفات نہیں جایا کرتے تھے اس کو اپنی کسر شان

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۲۳ ج ۳ [2] روح المعانی ص ۳۹ ج ۱۹

جانتے تھے کہ ہم تو اہل حرم ہیں ہمیں جانے کی ضرورت نہیں ہے اس جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے ذہن اور غلط دستور کی اصلاح فرمائی ہے، یہ بات نہیں جو مودودی صاحب نے فرمائی ہے

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ) — پھر تم وہاں سے کوچ کرو جہاں سے سب انسان کوچ کرتے ہیں

ایک دوسری آیت میں صاف طور سے ارشاد فرمایا ہے :-

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ — فرما دیجئے! اللہ کو پکارو یا رحمن کو پکارو جس نام سے بھی پکارو گے اسکے لئے اچھے ہی نام ہیں

یعنی محض اس چیز کی وجہ سے کہ مسلمانوں کے خدا کا نام رحمن اور رحیم ہے ہم نہیں مانتے یہ ذہن غلط ہے مودودی صاحب نے سورہ نمل میں خواہ مخواہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ذیل میں یہ بحث چھیڑ دی حالانکہ محل کلام کے اعتبار سے کوئی موقع نہیں تھا۔

الشعراء

رب العالمین کیا ہے

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ — فرعون نے کہا رب العالمین کیا ؟

فرعون کا یہ انداز اور قریش مکہ کے انداز "ما الرحمن" دونوں یکساں ہیں یعنی جس طرح وہ رحمن کو نہیں مانتے تھے ایسے ہی فرعون رب العالمین کو نہیں مانتا تھا بلکہ یہ لقب اس نے اپنے لئے خاص کر لیا تھا "انا ربکم الاعلیٰ" میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں لیکن جس طرح اللہ کے لئے رب العالمین ہونے کا

انکار ہے یا الفاظ دیگر اللہ کا انکار ہے یعنی رحمٰن اور رب العالمین وہی ایک ذات باری تعالیٰ ہے یہ زعم باطل ہے کہ رحمٰن اور رب العالمین کے انکار سے ذاتِ باری تعالیٰ شانہ کا انکار لازم نہیں آتا ہے

ہم شروع تفسیر سے برابر اس چیز پر نظر رکھے ہوئے ہیں کہ مودودی صاحب کو فرعون اور نمرود کا منکر خدا ہونا تسلیم نہیں ہے وہ نہایت شدت کے ساتھ اس بات پر ہر جگہ نہایت شدت اور کثرت کے ساتھ دلائل جمع کرتے ہیں گویا اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی بنیادی پالیسی میں فرق آجائیگا۔ اس پر ہم نے بہت غور کیا اس جگہ بھی مودودی صاحب نہایت شدت کے ساتھ فرماتے ہیں

لیکن جس چیز نے اسے (فرعون) کو غضبناک کر دیا وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اس طرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ گویا وہ ایک ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکم برتر کا پیغامبر آکر اس سے اطاعت امر کا مطالبہ کر رہا ہے[1]۔ الخ صفحہ ۲۸۵ ج ۳ فائدہ ۲۴

اس سورت پاک اور قرآن پاک کی تمام سورتوں میں عبارت قرآنیہ پر اگر غور کیا جائے تو مودودی صاحب کے نقطہ نظر کی تائید نہ ملے گی اس جگہ بھی ملاحظہ فرمائیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا

۱۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ	فرمایا (وہ) رب السماوات و الارض ہے اور جو اُن کے درمیان ہے اگر تم یقین رکھتے ہو
۲۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ	فرمایا (وہ) تمہارا اور تمہارے پہلے

---

[1] ہم نے پورے حاشیہ کو نقل نہیں کیا جس کا جی چاہے اصل کو دیکھ لے صرف ابتدائی چند سطریں نقل کی ہیں تاکہ ناظرین کو تلاش میں آسانی ہو آخر میں مودودی صاحب نے یہی تحریر کیا ہے کہ فرعون منکر خدا نہیں تھا۔

الاَوَّلِیْنَ	باپوں کا رب ہے
۳۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَہُمَا اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ	فرمایا (وہ) مشرق اور مغرب کا رب ہے اور جو ان کے درمیان ہے اگر تم عقل رکھتے ہو

فرعون نے یہ سب کچھ تقریر سننے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا

۴۔ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـہًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ	اگر تو نے میرے علاوہ کسی دوسرے کو الٰہ بنایا تو میں تجھے جیل بھیجدونگا

اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالےٰ ہی کو الٰہ بنائے ہوئے تھے اور فرعون کو یہ پسند نہیں تھا رہی یہ بات کہ فرعون کا معبود (اللہ تعالےٰ) کے علاوہ دوسرا (سورج وغیرہ) بھی تھا تو اس سے نفس معاملہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا جیسے ہی فرعون کسی دوسرے کو خدا بنائے ہو مگر وہ خدا کو خدا نہیں مانتا تھا اس کے مقابلہ میں تو اپنے آپ کو خدا ثابت کر رہا تھا کیا اپنے کو خدا کہلانے والا منکر خدا نہیں ہے۔ اہل فہم کے نزدیک تو منکر خدا ہے اسکو مودودی صاحب نہ تسلیم کریں تو یہ ان کی فہم ہے۔

قبول رسالت سے معذرت

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی ہٰرُوْنَ	موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا الٰہی! مجھے ڈر ہے کہ وہ میری تکذیب کریں گے اور میرا سینہ بھی گھٹتا ہے اور زبان بھی نہیں چلتی پس (اسکو) ہارون کیطرف بھیج

اس مضمون کی آیات دوسری سورتوں مثلاً سورۂ طٰہٰ سورۂ القصص میں بھی آئی ہیں ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی ہے کہ الٰہی میرے ساتھ میرے بھائی ہارون کو بھی میرا مددگار بنا دیجئے الخ اس جگہ مودودی صاحب کے نزدیک بات تو تقریباً وہی ہے مگر ذرا فرق کے ساتھ۔ فرماتے ہیں:-

۱۔ ممکن ہے کہ ابتداءً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست یہی رہی ہو کہ آپ کے بجائے حضرت ہارون کو اس منصب پر مامور کیا جائے الخ

صـ۸۲ـ ج ۳۔ فائدہ ۱۲

۲۔ اسی سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ موخرالذکر دونوں درخواستیں بعد کی تھیں اور پہلی بات وہی تھی جو حضرت موسیٰ سے اس سورے میں نقل ہوئی ہے الخ۔ ایضاً

وہ بعد کی دونوں درخواستیں کیا تھیں؟۔

۱۔ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ هٰرُوْنَ اَخِی — میرے لئے میرے خاندان سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر مقرر فرما دیجئے

۲۔ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْ — اور میرے بھائی ہارون وہ زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہیں ان کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر کہ وہ میری تصدیق کرے اور بھیج دیجئے۔

یعنی حضرت مودودی صاحب کے نزدیک صورت یہ تھی کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجنے کے لئے رسول مقرر کرنا چاہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عذر بیان کرتے ہوئے عرض کر دیا کہ آپ مجھے رسول مقرر نہ فرمائیں بلکہ میرے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو رسول بنا دیجئے اللہ تعالےٰ نے پھر دوبارہ ان کی درخواست پر رسول تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو بنایا لیکن ان کا شریک کار اور مددگار حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی مقرر کر دیا

مودودی صاحب سے یہ غلطی قرآن پاک کی عبارت میں غور نہ کرنے کی وجہ سے ہوری ہے آیت پاک ارسل امر کا صیغہ ہے اور فعل متعدی ہے اور یہ مفعول کو چاہتا ہے۔ یہ فعل متعدی بدو مفعول ہے دوسرا مفعول آلے

کے تذکرہ کے ساتھ لفظ ہارون مذکور ہے۔ دوسرا مفعول اس جگہ محذوف ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ محذوف کو متعین کرنے کے لئے کوئی قرینہ حالی یا مقالی ضرور ہوتا ہے۔ پھر حذف اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ جب کسی چیز کی عظمت اور اہمیت ظاہر کرنی مقصود ہوتی ہے اس کو بعض دفعہ تو صراحتاً ذکر کر دیتے ہیں اور بعض دفعہ حذف کر دیتے ہیں اس لئے مفسرین حضرات نے اس جگہ لفظ "ملکاً" فرشتہ محذوف مانا ہے اور اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت مصر سے باہر تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام مصر میں تھے اسلئے موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ جب میری درخواست قبول کر لی گئی تو رسالت یا نبوت کے منصب پر تقرری کی خبر میرے بھائی حضرت ہارون کے پاس بھی فرشتہ (جبرئیل) کے ہاتھ بھیجدیجئے کیونکہ پیغام رسالت کا کام حضرت جبرئیل ہی کیا کرتے تھے اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لطیف پیرایہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے مزید اعزاز کی درخواست کی اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ میرے پہونچنے سے پہلے حضرت ہارون کو بھی معلوم ہو جائے کہ وہ منصب نبوت پر فائز کر دئے گئے ہیں اس توجیہہ کو مان لینے سے یہ کہا جائیگا کہ اس آیت میں اجمال ہے اور پچھلی آیات میں تفصیل ہے

انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی ایسا نہیں گذرا کہ ان کے سپرد کار رسالت کیا جا رہا ہو اور وہ اس اعزاز کو جانتے ہوئے بھی اعراض کریں اور فرمادیں کہ یہ کام تو آپ کسی دوسرے سے لیجئے میں اس کا اہل نہیں ہوں گویا دبے الفاظ میں وہ انتخاب خداوندی پر اعتراض کر رہے ہیں کہ حضور آپنے اپنے انتخاب پر غور نہیں فرمایا میرے ساتھ تو یہ اعذار لگے ہوئے ہیں [۱]

---

[۱] اس تفصیل کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں۔ روح المعانی ص۶۵ ج ۱۹

دعائے ابراہیم علیہ السلام

وَاغْفِرْ لِاَبِیْ اِنَّهٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ	اور میرے باپ کی مغفرت فرما دیجئے وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھے قیامت کے دن رسوا نہ فرمائیے۔

اس کی تشریح میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت کی یہ توجیہ کی ہے کہ مغفرت بہرحال اسلام کے ساتھ مشروط ہے۔ اسلئے آنجناب کا اپنے باپ کی مغفرت کیلئے دعا کرنا گویا اس بات کی دعا کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام لانے کی توفیق عطا فرمادے لیکن قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جو تصریحات ملتی ہیں وہ اس توجیہ سے مطابقت نہیں رکھتیں[1] (فائدہ ۶۳ ج ۳ ص ۵۰۶)۔

مفسرین حضرات یا خود مودودی صاحب کی توجیہات میں اگر معقولیت ہو تو ان کو قبول کرنے میں کیا حرج ہے؟ ان کی تفسیر میں بہت سی معقول توجیہات ہیں جن پر ہم نے ذرہ برابر کلام نہیں کیا۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور قرآن پاک میں مطابقت کی بات ہے تو اس کے لئے ترتیب اور وقت دعا کو معین کرنا پڑیگا اس کے بعد ہی کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے قرآنی آیات پر نظر کرنے سے خیال اس طرف جاتا ہے (حقیقت حال سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے) کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے ظلم سے تنگ آکر گھر سے نکلے تو آپ نے فرمایا

۱۔ سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ — سلام علیک! میں اپنے رب سے

---

[1] اس اقتباس کی تفصیل چونکہ ہمارے جواب میں آگئی ہے اس وجہ سے پورا حاشیہ نقل نہیں کیا۔

لَکَ رَبِّیْ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا	آپ کیلئے دعا کرونگا وہ مجھ پر بہت مہربان ہے
۲۔ وَاغْفِرْ لِاَبِیْ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الضَّالِّیْنَ الخ	میرے باپ کی مغفرت فرما دیجئے وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے

یعنی میرے باپ کو توفیق اسلام دیدیجئے اور اس طرح ان کی مغفرت فرما دیجئے تاکہ قیامت میں بھی میری رسوائی نہ ہو کہ میرا باپ گمراہوں میں کھڑا ہو اور پورا عالم دیکھے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے اگر توفیق اسلام عطا ہو گئی تو میں آخرت کی شرمندگی سے بچ جاؤنگا اور اس کے اسلام سے بہر حال میری دعوت کو بھی تقویت پہونچے گی (جیسا جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کے اسلام کی دعا کی تھی اور اپنے چچا ابوطالب کو بھی کلمہ کی دعوت دی تھی۔

۳۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ (البقرہ)	الٰہی میرے والدین کی حساب کے دن مغفرت فرما دیجئے!

یہ دعا تعمیر کعبہ کے وقت کی تھی اور یہ وقت وہ ہے کہ حضرت اسحٰق پیدا ہو چکے تھے اور حضرت اسماعیل حرم مکہ میں موجود تھے اور یہ ثابت ہے کہ حضرت اسحٰق کی پیدائش عمر کے آخری حصہ میں ہوئی تھی جیسا کہ حضرت سارہ نے فرشتوں سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں بانجھ ہوں اور میرا شوہر بوڑھا ہے اس کے بعد ہی تعمیر بیت اللہ کا نمبر آیا تھا اور اسوقت آپ کی یہ دعا قرآن پاک میں منقول ہے اور یہ اقتضائے کلام سے ثابت ہے کہ اسوقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین انتقال کر چکے تھے اس کے بعد جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے مطلع کیا گیا کہ آپ کا والد ہمارا دشمن ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر دعا نہیں کی

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ — جب حضرت ابراہیم کو ظاہر ہوگیا کہ وہ دشمن خدا ہے تو اس سے برأت ظاہر کی۔

اس طرح یہ مطلب ہو گا کہ پہلی دعا قبول اسلام کے لئے تھی اور دوسری دعا (بیت اللہ کی تعمیر کے وقت) وعدہ کی بناء پر تھی اور وہ وعدہ والدین کے مرنے کے بعد پورا کیا گیا اور دعا کی گئی اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا سے رک گئے تھے اب اگر عدم مطابقت کی کوئی چیز ہے تو مودودی صاحب کی توجیہ میں ہے مفسرین کی توجیہات تو قرآن پاک کے عین مطابق ہیں۔

النمل

ادبی غلطی فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ — پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں ج ۳ ص ۵۷۱

اس کی تشریح ۳۹ میں فرماتے ہیں

یہاں پہنچ کر ہدہد کا کردار ختم ہو جاتا ہے ص ۵۷۱ ج ۳

اردو ادب میں کردار کا لفظ جس طرح مودودی صاحب نے استعمال کیا ہے ڈراموں اور افسانوں کی زبان میں بولا جاتا ہے کلام الٰہی کی تشریح کے لئے یہ جملہ ہرگز مناسب نہیں ہے۔ بات اس طرح بھی پوری ہو جاتی کہ یہاں تک ہدہد کا قصہ یا واقعہ تھا وہ ختم ہوا۔ ایسی ہی ایک بازاری جملہ سورۂ نور کی تشریح میں آگیا ہے فرماتے ہیں :-

تاہم کسی طرح بھی جائز نہیں کہ عورتیں اطمینان سے مردوں کو گھوریں اور ان کے حسن سے آنکھیں سینکیں ؎

؎ ملاحظہ فرمائیں تفسیر سورۂ نور

آنکھیں سینکنے کا محاورہ عام طور سے بس کنڈکٹر اور ڈرائیور جیسے استعمال کیا کرتے ہیں۔ تفسیر میں یہ جملہ مناسب نہیں۔ اطمینان سے گھورنے سے مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

۲۔ قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ

انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو! دیکھیں وہ صحیح بات تک پہونچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہ راست نہیں پایا کرتے

اس جگہ مودودی صاحب نے ترجمہ میں غلطی کی ہے ان کے ترجمہ کا مطلب یہ ہے کہ تخت کو اس طرح لاکر رکھو کہ اس کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکے کہ کون رکھ گیا ہے حضرت شیخ الہند رحمہ نے اس کا وہی ترجمہ کیا ہے جو عبارت قرآن سے ثابت ہے۔

کہا روپ بدل دکھلاؤ اس عورت کے آگے اس کے تخت کا ہم دیکھیں کہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہوتی ہے کہ جنکو سمجھ نہیں ص۴۹۳

یہی ترجمہ صاحب تفسیر روح المعانی نے کیا ہے اور یہی ترجمہ ابن کثیر نے ابن عباس اور ضحاک سے روایت کیا ہے لہ ہمیں مودودی صاحب کی تشریحات پر اعتراض نہیں ہے قرآن پاک کی عبارت میں نَكِّرُوا امر کا صیغہ ہے اور باب تفعیل سے ہے اس کے مادہ میں مبالغہ کا مفہوم داخل ہے جس کے اعتبار سے روپ بدلنا ہی زیادہ بہتر ترجمہ ہے یعنی تخت کو ایسا بنا دو کہ جلدی سے سمجھ نہ پائے اس سے اندازہ ہو جائیگا کہ سمجھ دار عورت ہے یا ناسمجھ ہے اسی ترجمہ کی تائید اگلے فقرہ سے ہو رہی ہے

قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ بولی گویا کہ یہ وہی ہے۔

اگر روپ بدلا ہوا نہ ہوتا تو کہنا چاہیے تھا نعم ہو ہذا، لیکن وہ شبہ کیساتھ

لہ روح المعانی ص۲۰۶ ج ۱۹ ابن کثیر ص۳۶۲ ج ۳ لغات القرآن ص۵۵ ج ۶

جواب دے رہی ہے گویا کہ تو وہی ہے۔ ظاہر عبارت قرآن تو یہ ہے اور تشریح میں ہر قسم کی گنجائش ہے لیکن مودودی صاحب نے نکّروا لھا کا مطلب ہی نہیں سمجھا "ان جان طریقہ" منکر کا ترجمہ نہیں ہوتا اس جگہ دوسرے تراجم کو بھی ملاحظہ فرمائیے!

۱۔ سلیمان نے حکم دیا (ملکہ کی عقل آزمائی کے لئے) اس کے تخت کی صورت بدل دو! (ڈپٹی نذیر احمد)

۲۔ کہا بدل ڈالو! واسطے تخت اسکا۔ دیکھیں ہم آیا راہ پاتی ہے۔ (شاہ رفیع الدین)

۳۔ سلیمان نے بلقیس کی عقل آزمانے کے لئے حکم دیا کہ اس کے لئے اس کے تخت کی صورت بدل دو! (حضرت تھانوی)

۴۔ کہا حضرت سلیمان نے کاریگروں کو کہ الٹ ڈالو بلقیس کے دکھانے کو اس کے تخت کے جواہر (شاہ عبدالقادر)

ان تمام تراجم سے ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے تخت میں تصرف کر کے اس کو ٹکڑا ادھر ادھر اوپر بنا دیا تھا۔ لیکن مودودی صاحب کے ترجمہ سے اس کی طرف کوئی دلالت نہیں ہے بلکہ طریقہ کو انجان ثابت کیا ہے اسلئے ہمارا یہ دعویٰ درست ہے کہ وہ نَكِّرُوا لَهَا کا مطلب ہی نہیں سمجھ پائے۔

القصص

فرعون کی خدائی

يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي

اور فرعون نے کہا اے اہل دربار میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا ہوں

(ص ۶۳۶ ج ۳)

اس آیت کی تشریح ۵۲ میں فرماتے ہیں :-

اس قول سے فرعون کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں تھا اور نہیں ہو سکتا تھا میں ہی تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہوں کیونکہ ایسی بات ایک پاگل ہی کے منہ سے نکل سکتی ہے۔ اور اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے کیونکہ اہل مصر کے مذہب میں بہت سے معبودوں کی پرستش ہوتی تھی اور خود فرعون کو جس بنا پر معبودیت کا مرتبہ دیا گیا تھا وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا سب سے بڑی شہادت قرآن مجید کی موجود ہے کہ فرعون خود بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ	اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے
أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ	کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ
لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَ	دیگا کہ ملک میں فساد برپا کریں اور
يَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ	تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں

مودودی صاحب نے فرعون کا ایک حیثیت سے دفاع کرنے میں غالباً بنیادی پالیسی اختیار کرلی ہے کہ وہ اپنے اس موقف سے نہیں ہٹتے ہیں۔ یہ ارشاد " ایسی بات کوئی پاگل ہی کہہ سکتا ہے " میں کہتا ہوں کہ ایسی بات کوئی پاگل کہے یا نہ کہے فرعون نے ضرور کہی ہے

مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي	اپنے علاوہ تمہارا معبود میں کسی کو نہیں جانتا۔

اور اے لوگو! اگر تمہیں اس میں کچھ شک ہے اور میرے علاوہ تمہارا کوئی دوسرا رب بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں " وہ رب العالمین ہے اور ایسا ایسا ہے تو چلو آج اس کا بھی فیصلہ کر دیا جائے قرآن شریف نے اس کے

بطور ذکر کیا ہے

فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى	اے ہامان میرے لئے مٹی کو پکا کر
الطِّينِ فَاجْعَل لِّي صَرْحًا	اینٹیں تیار کر اور ایک محل تیار کر
لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ	تاکہ میں جھانک کر دیکھ لوں موسیٰ
وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ	کے رب کو اور میرے گمان میں تو وہ جھوٹا ہے۔

یعنی خدا اور رب کوئی نہیں۔ (نعوذ باللہ) موسیٰ جھوٹا شخص ہے تاہم تم لوگوں کو اگر ذرا بہت شک ہو تو وہ اس طرح ختم ہو جائیگا۔ رہی یہ بات کہ فرعون اور اس کی قوم کے دوسرے معبود تھے جیسا کہ دوسری آیات میں موجود ہے۔ تو اس دلیل سے فرعون کے انکار کو کوئی سہارا نہیں مل سکتا اس نے چاہے دنیا بھر کو خدا بنا رکھا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ خدا کو خدا نہیں مانتا تھا (جیسا کہ مذکورہ الصدر آیت میں ہے)

ہمیں تعجب ہے کہ مودودی صاحب نے فرعون اور نمرود کے بارے میں یہ بنیادی پالیسی کیوں اپنا رکھی ہے اس جگہ ہو پہنچنے کے بعد وہ کچھ کچھ ظاہر ہو گئے ہیں۔

۱۔ اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کی پوزیشن ان ریاستوں کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو خدا کے پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت سے آزاد و خود مختار ہو کر اپنی سیاسی اور قانونی حاکمیت کے مدعی ہیں۔ وہ خواہ سرچشمہ قانون اور صاحب امر و نہی کسی بادشاہ کو مانیں یا قوم کی مرضی کو بہرحال وہ جب تک یہ موقف اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ملک میں خدا اور رسول کا نہیں بلکہ ہمارا حکم چلے گا اس وقت تک ان کے فرعونی موقف میں کوئی اصولی فرق نہیں آئے گا (اب یہ الگ بات ہے کہ بے شعور لوگ فرعون پر لعنت بھیجتے رہیں؛

اوران کو سند جواز عطا کرتے رہیں ص۶۳۸ ج ۳

مودودی صاحب کی عبارت پر تنقید و تبصرہ تو مناسب نہیں ہے عبارت سے یہ ترشح ہو رہا ہے کہ وہ اپنی ملکی سیاست سے بہت نالاں ہیں اس سیاست اور ملک کے سیاسی رجحان کو بدلنے کے لئے اور پاکستان میں حکومت الہیہ قائم کرنے کے لیے اور ملک میں خدا اور رسول کا فرمان جاری کرنے کے لئے انہوں نے صدر کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کو کھڑا کیا اگر وہ کامیاب ہو جاتیں تو مودودی صاحب کی حکومت الہیہ کا سربراہ ایک عورت اور وہ بھی بے دین ہوتی۔ بہر حال مودودی صاحب کا یہ پیچ و تاب فرعون اور نمرود کو منکر خدا مان کر وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے ملک کے سربراہ بالکل فرعون اور نمرود کی طرح ہیں خدا کے وجود کے وہ دونوں بھی منکر نہ تھے صرف اپنی من مانی کرتے تھے اور موجودہ حکمران بھی من مانی کرتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کے باوجود کیا پاکستان کے حکمران کافر ہیں؟ یا سب کافر تھے یا ایم ایوب خاں کافر تھے اگر نہیں تو پھر یہ تشبیہ کیسی کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی وجہ شبہ نہیں ہے محض اپنے دل کا بخار نکالنے کے لئے قرآن پاک کی صریح آیات کے مطالب میں اتنا بڑا تصرف کہ جس کی جسارت کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر مودودی صاحب اس کا ارتکاب کر رہے ہیں بھلا غور کیجئے جو آدمی خود کو رب اعلیٰ کہلاتا ہو تو وہ کب خدا کو رب اعلیٰ تسلیم کرتا ہے؟ اور منکر خدا ہونے کے لئے کوئی اور دلیل کی ضرورت ہے فرعون کے منکر خدا ہونے کے لیے ان آیات کو پھر ملاحظہ فرمائیے

۱۔ یَا اَیُّہَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ	اے سردارو! میں اپنے علاوہ تمہارا معبود کسی کو نہیں جانتا

یہ انکار نہیں ہے تو اور کیا ہے

۲۔ اِنِّیْ لَاَظُنُّہٗ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ	میں موسیٰ کو خدا کے معاملہ میں جھوٹا خیال کرتا ہوں

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جس ایک خدا کی طرف بلا رہے ہیں ہمارے نزدیک وہ جھوٹے ہیں بلکہ خدا کوئی نہیں ہے میں ہی تمہارا رب اعلیٰ ہوں

ایک آیت کا شان نزول

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ — آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ جس کو چاہے ہدایت دے سکتا ہے

صحیحین کی روایت ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے ان کا جب آخری وقت آیا تو حضور نے انتہائی حد تک کوشش کی کہ وہ کلمہ لا الہ الا اللہ پر ایمان لے آئیں تا کہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو مگر انہوں نے ملت عبد المطلب پر ہی جان دینے کو ترجیح دی اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا الخ صفحہ ۶۵ ج ۳ فائدہ ۷۹۔

اس کے بعد ان کی طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ محدثین و مفسرین کا طریقہ معلوم ہے کہ وہ کسی آیت کو جو عہد نبوی پر چسپاں ہوتی ہے اسکو شان نزول قرار دیتے ہیں الخ

محدثین اور مفسرین حضرات کے نزدیک شان نزول سے مراد کیا ہے؟ اسکو اگر ذکر کیا جائے تو بحث طویل ہو جائے گی اس کے لئے علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب الاتقان کو دیکھنا چاہیئے۔ اور مفسرین نے جو صراحت کی ہے کہ یہ آیت ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن اس کے باوجود مودودی صاحب کا اس سے اعراض کرنا اور شان نزول کی کوئی دوسری تاویل کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے

لہ تفسیر ابن کثیر ص ۳۹۴ ج ۳ مظہری ص ۱۴۶ ج ۷

بات دراصل یہ ہے کہ مودودی صاحب اس سورت کو مکہ کے دور متوسط کی قرار دے رہے ہیں (ہمیں اس سے اختلاف نہیں) اور ابو طالب کی وفات ابتدائی دور میں ہوئی تھی اسکی وجہ سے مودودی صاحب کو اشکال ہوا کہ وسطی زمانہ کی سورت میں ابتدائی زمانہ کی آیت کو کیوں لاکر رکھ دیا گیا لیکن میں کہتا ہوں کہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ آیت اس واقعہ سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے جو اس سے قبل والی آیت میں ذکر ہے کہ حبشہ سے ایک وفد حضور کی خدمت میں آیا اور مسلمان ہو گیا۔ وہ دور والے لوگ تو مسلمان ہو گئے اور قریب والے لوگ (اہل مکہ) مسلمان نہ ہوئے اس وجہ سے اللہ تعالےٰ نے مطلع فرمایا ہے کہ آپ جس کو چاہے ہدایت نہیں دے سکتے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت دے سکتا ہے۔ اگر مودودی صاحب اپنی ہی تحریر پر نظر فرمائیں تو ان کو اپنے قول کی غلطی معلوم ہو جائے گی وہ سورۂ بقرہ کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

اس سورت کا بیشتر حصہ ہجرت مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے اور کچھ حصہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا ہے اور مناسبت مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا ہے حتیٰ کہ سود کی ممانعت کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ میں اتری تھیں ص ۴۶ ج ۱

یہی بات ہم سورۂ القصص کی مذکورہ آیت کے بارے میں صحیحین کی حدیث کی وجہ سے کہتے ہیں کہ آیت تو نازل ہوئی ہے ابو طالب کے ایمان کے متعلق لیکن چونکہ اس جگہ مضمون سے بہت گہری مناسبت ہے کہ حبشہ کے عیسائیوں کا ایک وفد آکر مسلمان ہو گیا جس کا خیال بھی

نہیں کیا جا سکتا تھا اور جن کو دعوت دی جا رہی تھی اور جن کے ایمان قبول کرنے کے لئے حضورؐ بہت کوشاں تھے یعنی مشرکین وہ مسلمان نہ ہوئے اس کے بعد یہ آیت ہے۔ اب سیاق کلام کو ملا کر پڑھیئے تو ادنیٰ درجہ بھی فرق معلوم نہ ہوگا۔ کیا یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ آیت تو نازل ہوئی تھی ابوطالب کے بارے میں مگر اس واقعہ سے بھی بہت مطابقت رکھتی ہے اس طرح حدیث صحیحین درست ہے اور بات بھی ٹھیک ہے اور مفسرین نے جو فرمایا ہے وہ بھی حق بجانب ہے لیکن افسوس کہ مودودی صاحب تنقید کے شوق میں بات سمجھ نہ پائے اور جو پہلے کہا تھا اس کو بھول گئے

معاد سے مراد کیا ہے؟

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْآنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ	اے نبی یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو

پہونچانے والا ہے ص ۶۶۷ ج ۳

فائدہ ۱۰۹ میں تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ معاد کے لغوی معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف آخرکار آدمی کو پلٹنا ہو اور اسے نکرہ استعمال کرنے سے اس میں خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مقام بڑی شان و عظمت کا مقام ہے بعض مفسرین نے اس سے مراد جنت لی ہے الخ

۲۔ بعض مفسرین نے یہ خیال کیا کہ سورۂ قصص کی یہ آیت مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے راستہ میں نازل ہوئی تھی اور اس میں اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ آپ کو پھر مکہ واپس پہونچائے گا لیکن اول تو اس کے الفاظ میں

کوئی گنجائش اس امر کی نہیں ہے کہ معاد سے مراد مکہ لیا جائے
دوسرے یہ سورۃ روایات کی رو سے بھی اور اپنے مضمون کی داخلی
شہادت کے اعتبار سے بھی ہجرت حبشہ کے قریب کے زمانے
کی ہے اور یہ بات...... سمجھ میں نہیں آتی کہ کئی سال بعد ہجرت
مدینہ کے راستہ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی تو اسے کس مناسبت
سے اس سیاق وسباق میں لاکر رکھ دیا الخ

محترم! ابھی گذشتہ سطور آپ کے سامنے ہیں۔ حرمتِ ربو کا حکم (آپ کے ہی الفاظ میں) نازل ہوا سنہ ۹ھ میں اور اس کے حکم کی آیات رکھ دی گئیں سورۂ بقرہ میں جو سنہ ۲ھ میں نازل ہوئی تھی۔ یہ آپ کے اصول مفروضہ کی غلطی ہے کہ قرآن پاک کی "کل سورت" گویا ایک بار ہی نازل ہوئی ہے اور مثلاً مودودی صاحب کے ہی الفاظ میں) اس میں اتنے خطبے یا تحیا تقریریں ہیں" اگر کوئی غیر مسلم ہندی یا انگریزی میں تفہیم القرآن کا ترجمہ کرنے لگے تو وہ یہی نتیجہ نکالے گا کہ قرآن پاک اور اس کی سورتیں کیا ہیں؟ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریروں اور خطبوں کا ایک مجموعہ ہے

۳۔ تیسرے اس سیاق وسباق کے اندر مکہ کی طرف حضور کی واپسی
کا ذکر بالکل بے محل نظر آتا ہے۔

محترم! اگر آپ کی سمجھ میں بات نہ آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بے محل ہے یا اور کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

آیت کے یہ معنی اگر لئے جائیں تو یہ کفار مکہ کی بات کا جواب
نہیں بلکہ ان کے عذر کو اور تقویت پہونچانے والا ہوگا اس کے
یہ معنی ہونگے کہ بے شک اے اہل مکہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ محمدؐ
اس شہر سے نکال دئے جائینگے لیکن وہ مستقل طور پر جلا وطن نہیں
رہیں گے بلکہ آخر کار ہم انہیں اس جگہ واپس لے آئینگے یہ روایت

اگرچہ بخاری ، نسائی ، ابن جریر اور دوسرے محدثین نے ابن
عباس رض سے نقل کی ہے لیکن یہ ہے ابن عباس رض کی اپنی ہی رائے
کوئی حدیث مرفوع نہیں ہے کہ اسے ماننا لازم ہو صفحہ ۴۲۶ فائدہ ۱۰۸

صحابی کی رائے جس کی سند صحت میں کلام نہیں ہے اور وہ اسلام کا بہت
بڑا عالم بھی ہے اور قرآن پاک کا بہترین مفسر ہے اس کو امت نے تسلیم
کیا ہے جس کے تفقہ کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تعریف
کی ہے جس کے سامنے قرآن پاک نازل ہوا ہے وہ قرآن پاک کو زیادہ
جانتا ہوگا یا آپ ؟ کیا آپ ہم کو یہ حق دینا پسند کرینگے کہ آپ کی یہ رائے
(جس کی بنیاد صرف آپ کی اپنی اٹکل پر ہے) دیوار سے مار دینے کے قابل
ہے جس آیت کے شان نزول کے بارے میں مودودی صاحب نے انکار
کیا ہے کہ معاد سے مراد مکہ معظمہ نہیں ہوسکتا اس کے بارے میں فخرالدین
رازی نے کہا کہ معاد سے مراد مکہ ہے اور

وھٰذا اقرب الی الصواب	اور یہ قول زیادہ اقرب الی الصواب
لان ظاھر المعاد انہ	ہے کہ ظاہراً معاد مکہ ہے کیونکہ
کان فیہ وفارقہ وحصل	آپ اس میں رہتے تھے اور اس
العود الیہ وذلک لایلیق	سے جدا ہوئے اور پھر اس کی
الا بمکۃ	طرف لوٹ آئے یہ صرف مکہ ہی
	کے لئے زیادہ مناسب ہے

اور اس کے بعد فرماتے ہیں

وھٰذا احد ما یدل	یہ دلائل نبوت میں سے ایک ہے اسلئے
علی نبوتہ لانہ اخبر	کہ آپ نے غیب کی خبر دی اور ویسا ہی
عن الغیب ووقع کما	ہوا جیسا کہ خبر دی تھی تو یہ ایک معجزہ
اخبر فیکون معجزاً لہ	بھی ہے

لہ تفسیر کبیر صفحہ ۲۲ ج ۲۵ تفسیر مدارک علی الاکلیل صفحہ ۲۶ ج ۳ روح المعانی صفحہ ۱۲۸ ج ۲۰

اس چیز کو بیہقی نے اپنی کتاب دلائل نبوت میں بھی بیان کیا ہے اور قتیبی نے کہا ہے معاد آدمی کے مولد (پیدائش گاہ) کو کہتے ہیں اس طرح یہ لفظ عود سے ماخوذ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضورؐ کا مولد مکہ ہی تھا پھر اہل عرب کے نزدیک مکہ کے جہاں اور دوسرے نام تھے وہاں معاد بھی ایک نام تھا کیونکہ تمام عرب ہر سال اسی کی طرف لوٹتے تھے[1] بہر حال جبکہ متعدد اسناد سے مروی ہے خصوصاً شیخین کی روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ معاد سے مکہ مکرمہ مراد ہے تو پھر انکار کی کیا گنجائش ہے ؟ یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ معاد سے مراد جنت بیت المقدس، آخرت، موت کو بھی قرار دیا گیا ہے اور یہ سب احتمالات آیت کے مضمون کے مطابق ہیں۔ ان سب میں اقرب الی الصواب جو ہے وہ مکہ مکرمہ ہے اس قول کو اختیار کرنے سے مزید ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہے کہ یہ دلائل نبوت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزے کو ظاہر کر رہی ہے ہی مثلیت والی بات کہ یہ توجیہ اختیار کرنے سے بات بالکل بدل جائے گی اور ایک طرح مشرکین کے موقف کی تائید ہو جائے گی تو یہ سراسر سیاق کلام کے بالکل خلاف ہے کلام اللہ کو اٹھا کر دیکھیے

۱۔ شروع سورہ سے بہت دور تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی قصہ بیان ہوا ہے اور ان قصوں سے مقصود صرف قصہ گوئی نہیں ہے بلکہ نصیحت اور موعظت اور عبرت دلانا مقصود ہوتا ہے

۲۔ قصہ موسیٰ اور فرعون کو ختم کرنے کے بعد اَلَّذِيْنَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے ان اہل کتاب کے ایمان لانے کا قصہ ہے جو حبشہ سے آئے تھے اور مشرکین مکہ نے ان کا مذاق اڑایا تھا ان دونوں میں ربط یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون وہامان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے وہ تو ایمان نہ لائے اور ان کی اصلاح نہ ہوئی بلکہ دوسرے ایمان لائے ایسے

---

[1] ایضاً اس عنوان پر ہم نے تفصیلی کلام اپنی کتاب تاریخ الاحکام میں کیا ہے

ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطب تو ہیں اہل مکہ مگر وہ ایمان نہ لائے دوسرے لوگ حبشہ سے آکر مسلمان ہو گئے

۳ ۔ غالباً اسی ربط مضمون کی بنا پر یہ آیت مبارکہ "اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ" اس جگہ رکھی گئی ہے

۴ ۔ اس کے بعد مشرکین مکہ کا ایمان نہ لانے کا عذر ہے وَقَالُوْا اِنْ نَّتَّبِعِ الْھُدٰی الخ کہ اگر ہم نے آپ کی ہدایت کی پیروی کی تو ہمیں اچک لیا جائیگا اور ہمیں دوسرے قبائل جینے نہ دینگے

۵ ۔ اس کے بعد فرمایا تمہارا گمان باطل ہے تم سے پہلے ایمان نہ لانے کی وجہ سے بہت سی بستیوں کو تباہ کر دیا ہے یہ ان کے کھنڈرات پڑے ہیں وہ ان میں بہت ہی کم رہے ۔ حقیقۃً وارث ہم ہی ہیں

۶ ۔ اس کے بعد مشرکین سے خطاب ہے تمہارے پاس کیا ہے بہت ہی کم پونجی ہے اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ باقی رہنے والی ہے اس مضمون کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے

۷ ۔ موقع کی مناسبت سے پھر قارون کا اور اس کی دولت کا قصہ اور اس کے برباد ہونے کو بیان فرمایا ہے

۸ ۔ اس کے بعد ارشاد ہے تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا الخ یہ دار آخرت جس کے بارے میں تمہیں بتایا گیا ہے یہ صرف ان ہی لوگوں کا حصہ ہے جو زمین میں اکڑتے نہیں پھرتے اور نہ فساد پھیلاتے ہیں

۹ ۔ اس کے بعد ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت بھی اور آپ کو تسلی بھی دی گئی ہے

سورہ قصص کا یہ مربوط خلاصہ ہے جس میں مودودی صاحب کو ربط نظر نہیں آیا کہ اگر معاد کا ترجمہ مکہ کر دیا جائے تو موقع محل کے اعتبار سے مناسب نہ ہوگا بلکہ اس کی گنجائش نہیں ہے بلکہ مشرکین مکہ کے موقف کی تائید ہو رہی ہے

میں کہتا ہوں تائید نہیں بلکہ ان کے گمان باطل کی تردید ہو رہی ہے اگر اسی رَو میں قلم کو چلا دیا جائے پھر مستقل ایک جلد اسی مضمون کے لئے درکار ہوگی۔
لیکن ہم مودودی صاحب کی طرح نہیں ہیں کہ الفاظ کے ریلے میں اصل بات کو بہا دیں مودودی صاحب کی تحریر کے اقتباسات اس کتاب میں بہت آچکے ہیں سوائے الفاظ کے ڈھیر کے انہوں نے تماشہ ہی کیا دکھایا ہے ان کی تحریر کی چیستاں ملاحظہ فرمانے کے لئے جام ملاحظہ فرمایئے "فرعون کی ربوبیت کی سیاسی خداوندی"

الاحزاب

اخذ میثاق

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا لِّیَسْــٴَـلَ الصّٰدِقِیْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ

(اور یاد کیجئے) جب لیا ہم نے انبیاء سے عہد اور آپ سے اور نوح ع اور ابراہیم ع اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے اور لیا ان سے ہم نے میثاق غلیظ۔ تاکہ پوچھا جائے صادقین سے ان کی سچائی کے بارے میں

اخذ میثاق کے بارے میں تفصیلی بحث (اختصار کے ساتھ) اسی عنوان کے تحت گذر چکی ہے اسی آیت کی تشریح میں۔ اخذ میثاق کے بارے میں جناب مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات دلاتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ سے بھی اللہ تعالیٰ نے

ایک پختہ عہد لے چکا جس کی آپ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہئے۔ اس عہد سے کونسا عہد مراد ہے؟ اوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آرہا ہے اس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اس سے مراد یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی خود اطاعت کریگا اور دوسروں سے کرائیگا الخ

ص۴۷ ج ۴ فائدہ ۱۵

اس کے بعد متعدد آیات ذکر کی ہیں باوجود تفصیلی بحث کے ذرہ برابر بھی اشارہ نہیں دیا ہے کہ اس آیت میں اخذ میثاق دو ہیں اور آیت کا جو ترجمہ ہم نے بیان کیا ہے اور جو تشریح حوالوں کے ساتھ ہم ذکر کر رہے ہیں اس سے اسی طرح صرف نظر کیا ہے جس طرح پہلے کیا تھا (اس جگہ اسی کتاب میں گذشتہ صفحات پر نظر ڈال لی جائے۔

جتنی سطریں مذکورہ اقتباس میں ہم نے ذکر کی ہیں اس سے اتنا تو واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک سب انبیاء سے ایک عہد لیا گیا الخ انہوں نے پوری بحث میں کہیں بھی یہ اشارہ نہیں دیا ہے کہ اس آیت میں دو عہد مذکور ہیں ایک میثاق عام اور ایک میثاق غلیظ واؤ عاطفہ کے ذریعہ سے دونوں کا تغایر اور مختلف ہونا ظاہر ہے اگر صرف میثاق غلیظ ہی مراد ہوتا تو عبارت قرآن اس طرح ہونا چاہئے تھی

واخذنا من النبیین ومنک ومن نوح وابراھیم وموسیٰ وعیسی ابن مریم میثاقا غلیظا

لیکن عبارت قرآن اس طرح نہیں ہے پہلے میثاق النبیین ہے اور اس میں منک کے خطاب سے آپ شامل ہیں اور من نوح سے لیکر واخذنا منھم میثاقا غلیظا سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خارج ہیں عبارت قرآن خود بتلا رہی ہے کہ ان دونوں میثاقوں میں تغایر ہے ورنہ

جس طرح مودودی صاحب نے ذکر کیا ہے نسقِ کلام اس طرح ہونا چاہیے تھا وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ وَمِنْكَ مِيثَاقًا غَلِيظًا لیکن ہر دو طرح نسق کلام اس طرح نہیں ہے اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے مندرجہ ذیل آیت میں ہے

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا	پس جب آیا ہمارا عذاب تو
هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ مَعَهٗ	نجات دی ہم نے ہود کو اور جو
وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ	ان کے ساتھ تھے اور نجات
غَلِيْظٍ	دی ہم نے انکو عذاب غلیظ سے

بہرحال مندرجہ بالا زیر بحث آیت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے تبلیغ رسالت کے بارے میں عہد لیا گیا تھا اور دیگر انبیاء علیہم السلام سے (جن میں سے یہ چاروں حضرات جو صاحب شریعت و کتاب اور اولو العزم رسولوں میں جن کا شمار ہے ان سے میثاق غلیظ لیا گیا تھا کہ تبلیغ رسالت بھی فرمائیں گے اور ایک دوسرے رسول کی تصدیق کریں گے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان فرمائیں گے میثاق غلیظ سے مراد پختہ عہد ہے جس کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ عہد تھا[1] کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی خود بھی تصدیق کریں اور اپنی امت سے بھی عہد لیں۔ اور یہ بات واؤ عاطفہ کے ذریعہ کتاب اللہ ہی سے ثابت ہے کہ اخذ میثاق اور چیز ہے اور میثاق غلیظ اور چیز ہے

غزوہ خندق میں فرشتے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا	ایمان والو! اللہ تعالٰی کی
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ	نعمت اپنے اوپر یاد کرو جب

---

[1] روح المعانی ص۱۵۰ ج۲۱ مظہری ص۳۱ ج۷۔ ابن کثیر ص۴۶۹ ج۳

جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْہِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا
تمہارے (چاروں طرف سے) لشکر آئے تھے پس ہم نے ان پر ہوا اور ایسے لشکروں کو بھیج دیا جن کو تم دیکھتے نہیں تھے

قرآن پاک کی عبارت سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالے نے غزوۂ خندق کے موقع پر ایسے لشکروں کو مسلمانوں کی امداد کے لیے بھیجا جو نظر نہیں آتے تھے ظاہر ہے کہ یہ فرشتوں کے لشکر تھے[1] جنہوں نے قتال تو نہیں کیا البتہ کافروں کے قلوب پر رعب طاری کر دیا اور وہ دہشت زدہ ہو گئے یہ معنی مراد لینے کے لئے قرینہ بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالے نے غزوۂ بدر میں فرشتوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کی مدد فرمائی تھی اور فرشتوں نے کافروں کے ساتھ جنگ بھی کی تھی اسلئے ظاہر عبارت سے تو یہی ثابت ہے اس کے بارے میں یہ کہنا مناسب نہیں

فوجوں سے مراد فرشتے بھی لئے جا سکتے ہیں اگرچہ یہاں فرشتوں کی فوجیں بھیجنے کی صراحت نہیں ہے

اور یہ صراحت ہونا ضروری نہیں ہے جبکہ دوسری جگہ جنگ کے لئے فرشتوں کی آمد قرآن ہی سے ثابت ہے

۱۔ مثلاً غزوہ بدر کے موقع پر ۲۔ غزوہ حنین کے موقعہ پر
۳۔ ہجرت کے وقت جب کافر آپ کا تعاقب کر رہے تھے۔
۴۔ غزوہ احد کے موقعہ پر
۵۔ بنی قریظہ کے غزوہ کے وقت بخاری شریف کی حدیث سے فرشتوں کی شرکت ثابت ہے اس کے بعد مودودی صاحب کیا فرمائیں گے۔؟
۶۔ غزوہ احزاب میں قرآن پاک سے ثابت ہے فرشتے شریک تھے۔

---

[1] ایضاً تمام تفاسیر میں اس کا ذکر ہے کہ غزوۂ احزاب میں فرشتے شریک تھے۔

سورۃ التحریم

امہات المومنین

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا — اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں ص۲۲ ج ۶

سورۂ تحریم کی مذکورہ آیت کا ترجمہ جو مودودی صاحب نے اوپر تحریر فرمایا ہے اس آیت سے قبل والی آیات میں اس کا پس منظر موجود ہے

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (التحریم)

اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی عورت سے ایک بات پھر جب اس نے خبر کر دی اس کی اور اللہ نے جتلا دی نبی کو وہ بات تو جتلائی نبی نے اس میں سے کچھ اور ٹلا دی کچھ پھر وہ جب جتلائی عورت کو بولی کس نے جتلا دی یہ کہا مجھ کو بتایا اس خبر والے واقف نے (شیخ الہند)

وہ بات کیا تھی جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجہ محترمہ سے بطور راز فرمایا تھا اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالے نے اسکو ظاہر نہیں فرمایا بلکہ رازہی میں رکھا ہے اس لئے اس کی کھوج اور کرید میں ہمیں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے رہی یہ بات کہ وہ دونوں زوجۂ محترمہ کون تھیں؟ تو صحیح روایات سے حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت حفصہ رضؓ کے اسمار گرامی معلوم ہوئے ہیں مودودی صاحب نے اپنے ترجمہ میں جو تحریر فرمایا ہے وہ سیاق کلام کے

بھی خلاف ہے اور لغوی و مذہبی اعتبار سے بھی غلط ہے

۷۔ مودودی صاحب نے (اِنْ تَتُوْبَا) اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (شرط) تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے (جزا) یعنی کلام الٰہی میں شرط مذکور ہے اور اس کی جزا مودودی صاحب نے اپنی طرف سے متعین فرمادی ہے حالانکہ کلام الٰہی میں شرط اور جزا دونوں مذکور ہیں" فقد صغت " یہ جزا ہے اور اس میں فاء جزا کے لئے ہے مودودی صاحب نے یہ ترجمہ فرمایا ہے

"کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔"

اس جملہ کو تعلیل (سبب یا علت ظاہر کرنے والا) جملہ قرار دیا ہے حالانکہ کلام الٰہی میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے یعنی کلام الٰہی میں شرط اور جزا دونوں مذکور ہیں اس لئے بلا کسی ضرورتِ سخن کے تیسرا جملہ بالکل بے فائدہ ہے اور لغو ہے۔ آئیے! اس جگہ ہم دوسرے تراجم کی طرف بھی رجوع کریں۔

۱۔ اگر تم دونوں توبہ کرتی ہو تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے (شیخ الہند)

۲۔ اگر توبہ کرتی ہو تم دونوں طرف خدا کی پس تحقیق کج ہو گئے ہیں دل تمہارے (شاہ رفیع الدین)

۳۔ اے پیغمبر کی دونوں بی بیوں اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو تمہارے دل مائل ہو رہے ہیں (حضرت تھانوی)

ان تینوں ترجموں میں کلام اللہ میں شرط اور جزا دونوں کے ترجمے ہیں کسی تیسرے جملہ کا اضافہ نہیں ہے کیونکہ سیاق اور محل کلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ادبی ضرورت کا تقاضہ ہے کہ تیسرے جملہ کا اضافہ کیا جائے۔ مودودی صاحب نے ترجمہ میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اس طریقہ کو بعض دوسرے لوگوں نے بھی اختیار کیا ہے ہم ان ترجموں کو بھی ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد تبصرہ کریں گے

۴۔ اے دونوں بیویو اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو بہتر ہے کیونکہ

تمہارے دل مائل ہو رہے ہیں
(احمد سعید)

۵۔ پیغمبر کی دونوں بیبیوں (اس حرکت سے) خدا کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے کیونکہ) تم دونوں نے کجرائی اختیار کی ہے (ڈپٹی نذیر احمد)

یعنی مودودی صاحب کے ترجمہ کے مقابلہ میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ میں زیادہ پھوڑپن ہے اور مولانا احمد سعید کے ترجمہ میں وہی بات ہے جو مودودی صاحب کے ترجمہ میں ہے لیکن اس نقص کی تلافی انہوں نے مولانا تھانوی کا لفظ (مائل ہو رہے ہیں) کو اختیار کر کے کر دی ہے اس کے بعد لغات قرآن کی طرف توجہ کیجائے۔

توبہ کے معنی اللہ کی طرف رجوع ہونا، لوٹنا، واپس ہونا

صغیٰ۔ مڑنا اور جھکنا۔ مائل ہونا بولا جاتا ہے "اصغاء الاناء" برتن کو لڑھکا دیا یہی معنی حدیث اور فقہ میں سورۃ الہرۃ کے باب میں ذکر کئے ہیں اور زیغ کے معنی بھی ٹیڑھا ہونے کے آتے ہیں لیکن لغۃً صغ اور زیغ میں فرق ہے لغت میں الفاظ کی سختی معنی کی سختی پر دلالت کرتی ہے لہ پھر جھکنا اور مائل ہونا حق کی طرف بھی ہوتا ہے اور غیر حق کی طرف بھی اس جگہ توبہ (رجوع الی اللہ) کے ساتھ یہ لفظ مذکور ہے تو سیاق کلام اور محل کلام کے اعتبار سے یہ معنی زیادہ مناسب ہیں۔

اگر تم دونوں توبہ (رجوع) الی اللہ کرو تو اس کے لئے تمہارے قلب زیادہ مائل ہیں اور ان میں اللہ کی طرف جھکاؤ زیادہ موجود ہے

کیونکہ یہ ازواج مطہرات میں سے ہیں اور نبی کی پاک بیویاں ہیں حضور کی صحبت یافتہ اور آپ کی شریک حیات ہیں پھر حضرت ابوبکر صدیق رضا اور حضرت عمرؓ کی بیٹیاں ہیں رات دن وحی الٰہی کے انوار و برکات اور حضورؐ کی صحبت سے مستفیض ہوتی ہیں اور ایسا ہو بھی چکا تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج

لہ مختصر المعانی باب تعریف فصاحت و بلاغت

کو اختیار دیا اور حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا "تم اس اختیار میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر لینا تو حضرت عائشہ رضؓ نے جواب دیا تھا کہ کیا حضور میں آپ کے معاملہ میں مشورہ کرونگی میں اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں[1]۔ اسی قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں یہ بات دیگر ہے کہ نسوانی اور انسانی تقاضہ کی وجہ سے کسی وقت انہوں نے نان و نفقہ کا مطالبہ کیا لیکن فوراً ہی اس سے رجوع بھی کر لیا یہ سب چیزیں قرینہ ہیں کہ اس جگہ جھکنے اور مائل ہونے سے مراد اللہ کی طرف جھکنا ہے کیونکہ اس کے بعد والی آیت میں صاف طور پر تصویر کا دوسرا رُخ بھی دکھا دیا گیا ہے۔

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ — اگر تم دونوں نبی پر غلبہ کرنا چاہو

اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ — تو اللہ تعالیٰ ان کا مولا ہے

یاد رکھیے دونوں جگہ ان کے ساتھ شرط کا ذکر ہے نہ کہ دوسرے حروف شرائط کے ساتھ اس حرف کے ذریعہ جو شرط بیان کی جاتی ہے وہ یقین کا مفہوم نہیں دیتی۔ اس طرح یہ مطلب ہو گا:۔

بالفرض اگر تم اللہ کی طرف رجوع نہ کرو جس کے لئے تمہارے قلوب بھی مائل ہیں اور اگر بالفرض تم نبی پر غالب آنا چاہو تو اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہے

مودودی صاحب نے امام رازی، سید محمود آلوسی کے حوالہ سے فائدہ مٹ میں زیغ اور صیغ کے لغات بیان کئے ہیں وہ لغات اور ان کے معنی ٹھیک ہیں لیکن محل کلام اور سیاق کلام کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے اور خیال کرنا چاہیئے کہ کونسے معنی درست ہیں جیسا کہ باوا، باپ، والد، پدر وغیرہ ایک معنی پر دلالت کرتے ہیں اب اگر کوئی لڑکا کہے میرے باوا نے کہا، یا کہے میرے والد نے کہا تو ان دونوں کو ملاحظہ فرمائیے! ادب کس میں زیادہ ہے

[1] رواہ بخاری

اور مسل کلام ادبیت سے کون زیادہ قریب ہے

متفرقات

۱۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (الحاقہ) — پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں جو تم دیکھتے ہو (مودودی)

۲۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (القیامۃ) — نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی (مودودی)

۳۔ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (البلد) — نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی (مودودی)

ان آیات میں اور اسی قسم کی دوسری آیات میں جہاں لا کے ساتھ قسم کھانے کا صیغہ آیا ہے مودودی صاحب نے ان تمام جگہوں پر لَا کا ترجمہ نہیں کیا ہے ان کو غالباً یہ یاد نہیں رہا کہ یہ لَا کلام میں کیوں مستعمل ہوا ہے قبل اس کے کہ ہم لَا کے بارے میں کچھ بیان کریں ان تینوں جگہ کا دوسرے حضرات کا ترجمہ بھی دیکھ لیجیے۔

۱۔ سو قسم کھاتا ہوں میں ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو (شیخ الہند)
۲۔ قسم کھاتا ہوں میں قیامت کے دن کی ״
۳۔ قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی ״

۱۔ پس قسم کھاتا ہوں میں اس چیز کی کہ دیکھتے ہو تم (شاہ رفیع الدین)
۲۔ قسم کھاتا ہوں میں دن قیامت کی ״ ״
۳۔ قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی ״ ״

۱۔ پھر میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جکو تم دیکھتے ہو (حضرت تھانوی)
۲۔ میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ״ ״
۳۔ میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی ״ ״

۱۔ تو لوگو! جو چیز تم کو دکھائی دیتی ہے اور جو چیز تم کو دکھائی نہیں دیتی سب ہی کی قسم ہے (ڈپٹی نذیر احمد)

۲۔ ہم روز قیامت کی قسم کھاتے ہیں (ڈپٹی نذیر احمد)

۳۔ اے پیغمبر ہم اس شہر مکہ کی قسم کھاتے ہیں ״

۱۔ پھر میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جنکو تم دیکھتے ہو (احمد سعید)

۲۔ میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ״

۳۔ میں قسم کھاتا ہوں اس شہر یعنی مکہ کی ״

۱۔ قسم کھاتا ہوں میں اس چیز کی جو تم دیکھتے ہو (شاہ عبد القادر)

۲۔ قسم ہے مجھ کو قیامت کے دن کی ״

۳۔ قسم ہے مجھ کو اس شہر یعنی مکہ کی ״

ان سب تراجم پر نظر ڈالیے ! کسی نے بھی لا کا ترجمہ نہیں کیا صرف مودودی صاحب اس میں منفرد ہیں۔ یہ لاَ جو قسم کے ساتھ آتا ہے اس کی دو قسم ہیں کسی حرف کے بعد لاَ ہو گا جیسے

۱۔ فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ قسم کھاتا ہوں میں ستاروں کے داقع ہونے کی

۲۔ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ قسم کھاتا ہوں میں نفس لوامہ کی

یا کسی حرف کے بعد نہ ہو گا یعنی اس سے پہلے کوئی حرف نہ ہو گا جیسے

۱۔ لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ قسم کھاتا ہوں میں قیامت کے دن کی

۲۔ لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی۔

ہر دو صورت میں ابو بکر عیاش کے نزدیک اور یہی قول جمہور کا ہے لاَ زائدہ ہے۔ ایک قول ابو علی کا ہے جو نہایت فرسودہ قول ہے وہ کہتے ہیں لا نفی کے لیئے ہے اور اس کا تعلق کلام سابق سے ہے قسم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اسی قول شاذہ اور فرسودہ کو مودودی صاحب نے ترجمہ میں اختیار کیا ہے[1] حالانکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ شروع سورت میں کلام سابق سے کیا تعلق یہ بات تو اس جگہ کہی جا سکتی ہے جہاں درمیان کلام

---

[1] لغات القرآن ص۱۹۵ ج ۵

میں لا آرہا ہو لیکن مودودی صاحب نے قرآن شریف میں ہر جگہ قول شاذ کی ہی رعایت نہیں رکھی ہے بلکہ اس کو اختیار کر کے تعبیر قائم کر دی جس کی تردید سب نے کی ہے اور کسی نے بھی اس کو اختیار نہیں کیا ہے یہ کمال مودودی صاحب کی پوری تفسیر میں نظر آئیگا کہ ہر جگہ انہوں نے قول شاذ کو ہوا دی ہے غالباً یہ ان کے نزدیک قابلیت کی کوئی علامت ہے حالانکہ خرق اجماع یعنی اجماع کو توڑنا خالص پاگل پن کی دلیل ہے

المزمل

زمانہ نزول | سورہ المزمل کے زمانہ نزول کے بارے میں جناب مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے :-

اس سورت کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں پہلا رکوع بالاتفاق مکی ہے۔ الخ

دوسرے رکوع کے متعلق اگرچہ بہت سے مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی مکہ میں ہی نازل ہوا ہے لیکن بعض دوسرے مفسرین نے اسے مدنی قرار دیا ہے اور اس رکوع کے مضامین سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس میں قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ مکہ میں اس کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور اس میں فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے اور یہ بات ثابت ہے کہ زکوٰۃ ایک مخصوص شرح و نصاب کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے ص۱۲۱ ج ۶

مودودی صاحب نے دو وجہ سے سورہ المزمل کے رکوع ۲ کو مدنی قرار دیا ہے اولاً قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ثانیاً فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ہمارے نزدیک یہ بات تحقیقی معیار کے مطابق نہیں اور سرسری طور پر بعض مفسرین کی اقتداء میں

لکھی گئی ہے اگر سیاق کلام پر نظر ڈالی جائے تو اس قول کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ	اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ قریب
مَّرْضٰى وَآخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ	کے زمانہ میں تم میں سے کچھ تو مریض
فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ	ہونگے اور کچھ لوگ زمین پر چل کر
اللّٰهِ وَآخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ	اللہ کا فضل تلاش کرینگے اور کچھ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (المزمل)	اللہ کی راہ میں جنگ کرینگے۔

کلام پاک میں مضارع کے صیغہ یکون پر سین داخل ہے جس نے اس کے معنی مستقبل کے متعین کر دیئے ہیں یعنی خبر دی گئی ہے کہ اے مسلمانو! اگرچہ آج تم کمزور ہو اور محصور ہو، مظلوم ہو، بے دست و پا ہو لیکن زمانہ مستقبل میں یہ تعطل ختم ہوگا اور تم تجارت کے لئے زمین پر سفر بھی کروگے اور دشمنوں سے جنگ بھی کروگے۔ گویا اس جگہ آئندہ حالات کے بارے میں خبر دی گئی اور بشارت دی ہے قتال اور جنگ کرنے کا حکم نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے نکتہ پیدا کیا جائے کہ مکہ میں قتال کا سوال ہی پیدا نہ تھا علامہ ابن کثیر نے فرمایا ہے:-

> یہ پوری سورت مکی ہے اور اس کے نزول کے بعد اگرچہ قتال مشروع نہیں ہوا تھا بلکہ یہ دلائل نبوت کی ایک بڑی دلیل ہے کہ آئندہ پیش آنے والے حالات کی خبر دی گئی ہے [1]

دوسری بات ادائیگی زکوٰۃ اور فرضیت زکوٰۃ کے بارے میں رہ جاتی ہے سورۃ میں فرمایا ہے

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ	نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو

اس سے مودودی صاحب کو شک ہوا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ منورہ میں ہوئی ہے اسلئے یہ رکوع مدنی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ فیصلہ کر لینا بھی غلط ہے کیونکہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۴۳۹ ج ۴

دیکھنا یہ ہے کہ مکی سورتوں میں صرف اسی سورت میں زکوٰۃ وصلوٰۃ کا مطالبہ ہے یا اور سورتوں میں بھی اس کا مطالبہ مذکور ہے

۱- وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ (السجدہ)
مشرکین کی تباہی ہو جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں

سورۂ سجدہ مکی ہے اور اس میں کوئی آیت مستثنیٰ (مدنی) نہیں ہے اس آیت میں مشرکین پر ترک زکوٰۃ اور آخرت پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے عذاب ہوگا

۲- قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ (المدثر)
کہینگے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے

یہ سورۂ المدثر کی آیت ہے اور یہ بھی مکی ہے اس میں مشرکین کے بارے میں عذاب آخرت کی ...... خبر دی گئی ہے کہ وہ نماز ترک کرتے تھے یعنی انہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور نماز قائم نہیں کی سوال یہ ہے کہ جب نماز فرض ہی نہیں ہوئی تھی تو یہ عذاب کیوں ؟

۳- شاہ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے بارے میں ایک تقریر کی اس میں موجود ہے کہ حضور ہمیں نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، صلہ رحمی کا حکم فرماتے ہیں اور یہ بات سنہ نبوی کی ہے، اسی قسم کے اور بہت دلائل اور آثار ہیں جن سے نماز و زکوٰۃ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائے اسلام مکہ مکرمہ میں بھی محاسن میں شمار ہوتے تھے اور مسلمان ان کے مکلف تھے اسکی بہترین توجیہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمائی ہے

ایسے ہی زمانہ جاہلیت میں زکوٰۃ تھی اسی زکوٰۃ میں مہمان نوازی مسافر نوازی، عیال پروری، مساکین پر صدقہ اور خیرات، صلہ رحمی حوادث

میں امداد یہ سب زکوۃ میں داخل تھے [1]

یعنی اس زمانہ میں ابواب خیر میں انفاق کا نام زکوۃ تھا حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کے قریب قریب فرمایا ہے

فرضیت زکوٰۃ مکہ میں ہو چکی تھی لیکن نصاب زکوۃ اور مقدار زکوٰۃ اور مخرج یہ مدینہ میں ہوا ہے [2]

یعنی زکوۃ کو رکن اسلام اور دستوری صورت مع تمام ضوابط زکوٰۃ کے یہ مدینہ میں حاصل ہوئی ہے لیکن عبادت مالی کی پوزیشن یہ اس کو مکہ مکرمہ میں بھی حاصل تھی ان تحقیقات کی روشنی میں سورہ مزمل کے دوسرے رکوع کو پڑھا جائے تو اس کے مدنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس پر تفصیلی کلام ہم نے اپنی کتاب تاریخ الاحکام میں کیا ہے۔

اللیل

مناقب صدیق اکبرؓ

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى	اور بچا دینگے ہم اس (دوزخ) سے بڑے ڈرنے والے کو جو دیتا ہے
الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى	اپنا مال پاک کرنے کو اور نہیں
وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ	کسی کا اس پر احسان جس کا
تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ	بدلہ دے مگر واسطے چاہنے
الْأَعْلَىٰ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ	مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے اور آگے وہ راضی ہوگا (شیخ الہند)
(اللیل)	

ا۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح نے فوائد ترجمہ شیخ الہند میں تحریر فرمایا ہے ا۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب [2] ابن کثیر ج ۴

اگرچہ مضمون آیات کا عام ہے لیکن روایات کثیرہ شاہد ہیں کہ ان
آخری آیات کا نزول سیدنا ابوبکر صدیق رضہ کی شان میں ہوا
ہے اور یہ بہت بڑی دلیل ان کی فضیلت اور برتری کی ہے
(مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی)

۲۔ ہر چند کہ سورۃ اللیل کا مفہوم عام ہے لیکن جمہور مفسرین نے اس سورت کا تعلق اور اس کے شان نزول میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور امیہ بن خلف کا ذکر کیا ہے موخر الذکر ایک ملعون منکر تھا (الی قولہ) اسکو اشقیٰ فرمایا ہے اسی کے میں حضرت ابوبکر صدیق رضہ کا بھی وجود گرامی تھا جنہوں نے اپنے تمام مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا الخ (مولانا احمد سعید)

۳۔ ہر چند کہ الفاظ آیت کے عام ہیں مگر سبب اس کا قصہ ہے حضرت ابوبکر رضہ کہ انہوں نے حضرت بلال وغیرہ کو کافروں سے خرید کر آزاد کر دیا تھا اور یہ بات فی الدر المنشورہ میں متعدد سند کے ساتھ ہے (مولانا اشرف علی صاحب تھانوی)

۴۔ کہتے ہیں کہ اس سورت کی کئی آیتیں حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی شان میں ہیں اور کئی آیتیں امیہ بن خلف کافر کے حق میں ہیں (موضح القرآن)

۵۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی شان اور ان کی توصیف میں نازل ہوئی ہیں (مظہری)

۶۔ ابو حاتم نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضہ نے سات غلاموں کو خرید کر آزاد کر دیا جنکو اللہ کی راہ میں عذاب دیا جاتا تھا پس یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔

۷۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں (مظہری)

۸۔ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی شان میں نازل ہوئی ہیں (ابو سعود)

۹۔ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضہ کے حق میں وارد ہوئی ہیں (امام رازی)

۱۰۔ بہت سے مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رض کے متعلق نازل ہوئی ہیں اور بعض نے اس پر اجماع بیان کیا ہے (ابن کثیر)

یہ دس مثالیں تو بطور نمونہ کے ہیں ورنہ تفسیر کی کتابوں میں سے کوئی ایسی نہیں ہے کہ جس میں صراحتاً یہ بیان موجود نہ ہو۔ اب آئیے جناب مودودی صاحب کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائی جائے:

> اس کی بہترین مثال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ہے کہ مکہ معظمہ میں جن بے کس غلاموں اور لونڈیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اس قصور میں جن کے مالک ان پر بے تحاشہ ظلم توڑ رہے تھے ان کو خرید کر آزاد کر دیتے تھے۔ ا ھ صفحہ ۳۶۵ ج ۶

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رض کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں اس سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ حضرت ابوبکر رض ان کے نزدیک بطور مثال کے ہیں۔ قرآن پاک کا کسی شخص کے بارے میں نازل ہونا یہ کتنا بڑا اعزاز اور فضیلت ہے اس کو انہوں نے حذف کر دیا اور بطور مثال کے پیش کر دیا مثال کا جہاں تک تعلق ہے بہت سے حضرات مثال بن سکتے ہیں

یہ بات نہیں ہے کہ جناب مودودی صاحب نے پوری تفہیم القرآن میں کہیں بھی یہ بیان نہ کیا ہو کہ فلاں آیت فلاں واقعہ کے بارے میں ہے کئی جگہ انہوں نے اسکو بھی بیان کیا ہے مثلاً سورۃ المدثر میں بَنِيْنَ شُهُوْدًا کے تحت بیان کیا ہے

> ولید بن مغیرہ کے دس بارہ لڑکے تھے جن میں سے حضرت خالد بن ولید تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں ان بیٹوں کے لئے شہود کا لفظ استعمال کیا ہے صفحہ ۱۴۷ ج ۶

یعنی قرآن پاک کی عبارت میں صراحت سے کہیں ذکر نہیں ہے کہ سورۃ المدثر کی

یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں ہے احادیث کے ذریعہ ہی یہ نام متعین کیا جاتا ہے اور لیجئے۔ سورہ تحریم میں اِنْ تَتُوْبَا الخ کے تحت حضرت عائشہؓ اور حضرت صفیہ رضؓ کا نام لیا ہے اور یہ بھی حدیث شریف کی تصریح کی بنا پر ہے منشا ہمارا صرف اس قدر ہے کہ بہت جگہ انہوں نے تنقیدی پہلو سے نام ذکر کردیا ہے اور اکثر و بیشتر مقامات پر جہاں کوئی منقبت کا پہلو نکلتا تھا نام ذکر کرنے سے گریز کیا ہے۔ ایسے ہی آیات حجاب کے بارے میں ہے کہ وہ حضرت عمر رضؓ کی خواہش کے مطابق نازل ہوئیں مودودی صاحب نے اس طرف اشارہ کرنے سے بھی گریز کیا ہے اپنی پوری تفسیر میں اکثر و بیشتر وہ جمہور کی جماعت سے الگ تھلگ کھڑے نظر آتے ہیں شاید وہ اسی کو اپنے لئے اعزاز کی علامت جانتے ہوں۔

العادیات

غازیوں کے گھوڑے

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا فَالْمُوْرِيٰتِ	قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر پھر
قَدْحًا فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا	آگ سلگانے والے جھاڑ کر پھر
فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا فَوَسَطْنَ	غارت ڈالنے والے صبح کو پھر
بِهٖ جَمْعًا	اٹھانے والے اس میں گرد پھر

گھس جانے والے اس وقت فوج میں (شیخ الہند)

۱۔ ممکن ہے قسم کھانا گھوڑوں کی مقصود ہو جیسا کہ ظاہر ہے اور ممکن ہے کہ مجاہدین کے رسالہ کی قسم ہو حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ جہاد والے سواروں کی قسم ہے۔ اس سے بڑا کون عمل ہوگا کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان دینے کو حاضر ہے (فوائد عثمانی)

۲۔ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے منذر بیٹے عمر انصاری رضی اللہ عنہ کو کتنے صحابیوں پر سردار کر کے بنی کنانہ کی قوم پر بھیجا تھا اور فرمایا کہ فلانے دن صبح کے وقت جا کر ان کو لوٹنا اور اس دن مقرر پھر آئیو! یہ بات انہوں نے قبول کی اور موافق حکم کے کیا اور پھر آنے کے وقت راہ میں ایک نالا چڑھاؤ پر تھا اس سبب سے دیر ہوئی اور وعدہ مقررہ پر مدینے میں نہ پہونچے منافق لوگ طعنہ شروع کر کے کہنے لگے کہ وہ سب مارے گئے ان میں سے کوئی نہ بچا جو اُن کی خبر لاتا۔ اس بات سے مسلمان غمگین ہوئے خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کی تسلی کے واسطے یہ سورۃ بھیج کر ان سواروں کی خبر دی۔ (موضح القرآن)

یعنی حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک بھی جہاد کے گھوڑوں کی قسم سے مراد اس فوجی دستہ کی قسم ہے

۳۔ مراد اس سے لڑائی کے گھوڑے ہیں جہاد ہو یا غیر جہاد (مولانا تھانوی)

۴۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں غازیوں کے گھوڑوں کی قسم کھائی ہے (ابوالسعود)

۵۔ یہی بات جناب قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے فرمائی ہے اور مزید فرمایا کہ یہی قول ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، حسن، کلبی، قتادہ، مقاتل، ابوالعالیہ کا ہے اور شاہ صاحب نے جو بات بیان کی ہے اسی کو بزار اور دارقطنی کے حوالہ سے نقل کیا ہے (مظہری)

اس جگہ یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ یہ سورت مکی ہے اور روایات میں واقعہ مدینہ کا بیان کیا ہے حضرت شاہ صاحب نے نازل ہونے کے بارے میں نہیں فرمایا بلکہ بھیجنے کا لفظ لکھا ہے یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ سورت پڑھ کر خبر دی اس طرح ان مجاہدین کے اعزاز کی طرف لطیف اشارہ ہے لیکن اب مودودی صاحب کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے فرماتے ہیں:۔

۶۔ یہ ہے وہ بات جن پر گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے جو رات کو پھنکارتے ہیں اور چنگاریاں جھاڑتے ہوئے دوڑتے ہیں پھر صبح سویرے کسی بستی پر جا پڑتے

ہیں اور مدافعت کرنے والوں کی جماعت میں جا گھستے ہیں۔ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ اکثر مفسرین نے ان گھوڑوں سے مراد غازیوں کے گھوڑے لئے ہیں اور جس مجمع میں ان کے جا گھسنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد ان کے نزدیک کفار کا مجمع ہے (الی قولہ) اسلئے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس سورت کی ابتدائی پانچ آیات میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں ان کا اشارہ دراصل اس عام کشت وخون اور غارت گری کی طرف ہے جو عرب میں اس وقت برپا تھی جاہلیت کے زمانے میں رات ایک بہت خوفناک چیز ہوتی تھی جس میں ہر قبیلے اور بستی کے لوگ یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ نہ معلوم کونسا دشمن ان پر چڑھائی کرنے کے لئے آرہا ہو اور دن کی روشنی نمودار ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لیتے تھے (الی قولہ) اس ظلم وستم و غارت گری کو جو زیادہ تر گھوڑوں پر سوار ہو کر ہی کی جاتی تھی اللہ تعالیٰ اس امر کی دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے الخ ص ۴۳۱ ج ۶

اس فائدہ میں جناب مودودی صاحب نے بے سند دور کی ایک تاویل اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کی ہے اس کا ہم نے صرف خلاصہ دیا ہے کیونکہ محض الفاظ کی بھرتی ہے اور بات کچھ نہیں ہے ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جمہور مفسرین نے جو تاویل اختیار کی ہے اس سے اگر آپ کو عار یا گریز ہے تو پھر اتنی وزنی بات ہونی چاہیئے۔ یہ تو خیال فرمایئے کہ اتنے حضرات کی تاویل اور سند کے ساتھ آپ کی بے سند تاویل مقابلہ میں کیوں نہ مردود قرار پائے آپ ان حضرات کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں جو اہل لسان بھی ہیں اور جنکا تفقہ گروہ صحابہ اور تابعین سے ملتا ہے۔ تعجب ان کی رائے پر نہیں تعجب علامہ مودودی صاحب کی رائے اور تاویل پر ہے جبکہ اس کنایہ کے لئے ادنیٰ درجہ کی دلالت اور استعارہ کے لئے وجہ استعارہ نہیں ہے حضرات مفسرین کی رائے کی وجہ کی طرف حضرت شاہ صاحب نے صرف دو لفظوں میں اشارہ کر دیا ہے خیال فرمایئے۔

گھوڑا کتنا باوفا جانور ہوتا ہے کہ اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اپنے سوار
کی جان بچاتا ہے اور پھر مجاہدین کے گھوڑے تو عام گھوڑوں
سے کہیں بہتر ہوتے ہیں اس کو غازی سے اور غازی کو اس سے بے پناہ
محبت ہوتی ہے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھوڑے
کی مالش کیا کرتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی گھوڑوں سے
انسیت کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے

تو گویا مجاہد اور اس کے مرکب کی قسم کھا کر انسان کی ناشکری کا ذکر فرمایا ہے

إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ — بیشک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے

یعنی اس کو ناشکرا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ تمام انسانوں کو اپنے رب کی وفاداری
کا وہ نمونہ پیش کرنا چاہیئے جو غازی اور غازی کا گھوڑا پیش کرتا ہے۔ کلام الٰہی
کی فصاحت اور بلاغت پر غور کیا جائے کہ ان مختصر جملوں میں وفاء اور محبت اشکر
گذاری اور دیگر امور کا کتنا بڑا وعظ بھر دیا ہے لیکن مودودی صاحب کے
نزدیک یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

الماعون

زمانہ نزول جناب مودودی صاحب فرماتے ہیں ابن مردویہ نے ابن عباس
اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے
اور یہی قول عطا اور جابر کا بھی ہے لیکن ابو حیان نے بحر المحیط میں ابن عباس
قتادہ اور ضحاک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ ہمارے
نزدیک خود اس سورۃ کے اندر ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جو اس
کے مدنی ہونے پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں ان نماز پڑھنے والوں
کو تباہی کی وعید سنائی گئی ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے اور دکھاوے

کے لئے نمازیں پڑھتے ہیں منافقین کی یہ قسم مدینہ ہی میں[1] پائی جاتی تھی (الوظیفہ ج ۶ ص ۲۸)
مودودی صاحب کو جمہور کے فیصلہ سے ہٹ کر بات کرنے کی عادت
ہے اور وہ اپنی تفسیر میں اسی بات پر زیادہ زور دیتے ہیں جو قولِ شاذ
ہوتا ہے۔ اگر بالفرض ہم یہ بات کہدیں (جو اسی جگہ حاشیہ میں موجود ہے)
تو پھر کیا حکم ہوگا؟ یعنی وہ مکہ معظمہ میں منافقین کا وجود تسلیم کرتے ہیں تو
پھر کیا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ایسی نماز پڑھنے والے مکہ کے منافق بھی ہو سکتے
ہیں ان کے نزدیک کوئی تو وجہ حصر ہونا چاہیئے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ
جمہور مفسرین کے نزدیک سورۃ الماعون بالاتفاق مکی ہے۔ بعض حضرات
نے اس کی آخر کی تین آیتوں کو مدنی قرار دیا ہے جس کی تحقیق یہ ہے[2]

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ ‏ خرابی ان لوگوں کی جو اپنی نماز

---

[1] مودودی صاحب کے نزدیک منافقین کی دو قسم ہیں ایک قسم کے منافق وہ جو مدینہ منورہ میں پائے جاتے تھے اور دوسری قسم کے منافقین وہ جو مکہ معظمہ میں پائے جاتے تھے چنانچہ المدثر کی آیت مبارکہ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ کے تحت انہوں نے یہی انکشاف کیا ہے اور جلد سوم میں بھی چار جگہ ص ۶۷۲، ص ۶۷۹، ص ۶۸۰، ص ۶۸۲ پر انہوں نے اسی بات پر اصرار کیا ہے ہم کہتے ہیں اور یہی جمہور مفسرین کا قول ہے کہ نفاق کا مکہ معظمہ میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ مکہ معظمہ کی تیرہ سالہ آزمائشوں کے باوجود نفاق پایا جائے آخر کیوں؟ وہاں تو صرف دو ہی چیزیں تھیں ایمان یا کفر۔ ایمان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ کمزور ایمان والے بھی تھے لیکن ان کے پاس جیسا بھی ایمان تھا وہ اس پر قائم تھے مکہ معظمہ میں نفاق کی کوئی مثال نہیں ملتی اگر تاریخی روشنی میں مکہ کے کسی منافق کا نام پیش کر دیا جائے تو ہم مشکور ہونگے "فی قلوبہم مرض" سے نفاق ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ ہم کہتے ہیں اور یہی تاریخی حقیقت بھی ہے کہ مکہ معظمہ میں معترضین اور منکرین چند طرح کے تھے ملاحظہ فرمایئے تفصیل حجۃ اللہ البالغہ باب ۶۔

[2] ان ہی تین آیتوں کو مودودی صاحب نے سورۃ کی داخلی شہادت قرار دیا ہے

هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ — سے بے خبر ہیں اور دکھاوا کرتے
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ — ہیں اور مانگی نہ دیں برتنے
وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ — کی چیز (شیخ الہند)

حضرت ابن عباس رض اور قتادہ رح کے ارشاد کے بموجب یہ پوری سورت مدنی ہے (اسی کو مودودی صاحب نے اختیار کیا ہے) اور جمہور مفسرین اصحابؓ وتابعین) کے بلا استثناء کسی آیت کے یہ سورت مکی ہے[1] اور عاص بن وائل سہمی یا ولید بن مغیرہ یا عمر بن عائذ مخزومی یا ابوجہل مخزومی) کے بارے میں نازل ہوئی ہے حضرت شاہ عبدالعزیز نے تحریر فرمایا ہے۔

ابوجہل مردود کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی مالدار آدمی بیمار ہوتا تو اس کے پاس آکر بیٹھتا اور کہتا اپنے یتیموں کو میرے سپرد کر دو اور ان کا حصہ میرے پاس امانت رکھ دو۔ میں ان کی خبر گیری کروں گا تاکہ ان کے وارث ان پر زیادتی نہ کریں۔ ایک مرتبہ ایک مسکین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر شکایت کی اور حضور ص اس کی سفارش کے لئے ابوجہل کے پاس گئے مگر وہ نہ مانا تو اس وقت یہ سورت نازل ہوئی[2]

حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شیخ الہند رح کے ترجمہ کا کمال قابل داد ہے کہ انہوں نے ساہون کا ترجمہ "وہ لوگ جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں" کر کے کمال دکھلایا ہے رہی یہ بات کہ مکہ معظمہ میں وہ لوگ کون تھے جو نام نہاد نمازیں ادا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان پر عذاب ہوگا۔ قرآن پاک میں مشرکین کی ان نمازوں کا تذکرہ دوسری جگہ ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ — اور بیت اللہ کے پاس ان کی

---

[1] تفسیر اکلیل علی مدارک صـ۲۴۳ ج۶ [2] تفسیر فتح العزیز

الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ

نمازیں سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے سو اب عذاب کا مزہ چکھو اس کفر کے بدلے جو تم کرتے تھے۔

بہرحال جمہور کا قول ہی زیادہ مناسب ہے اس پر اگر قول شک وارد کیا جائے اس کا جواب قرآن پاک کی روشنی میں موجود ہے ورنہ دوسرا قول کہ اس سورت کی آخر کی تین آیات مدنی ہیں (جیسا کہ ابن عباسؓ اور قتادہ نے کہا ہے) کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ بلکہ قرین قیاس ہے۔ لیکن اس کے بارے میں مودودی صاحب اپنے مزاج کے مطابق یہ کہیں گے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی مختصر سورت اور اسکی چند آیتیں کم از کم بارہ چودہ سال بعد نازل ہوئیں ان کو کس مناسبت سے یہاں لاکر رکھ دیا؟ ہم کہتے ہیں یہ سورت تمامہ مکی ہے اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔

فہرست مضامین

مدنی دار التالیف بجنور یوپی

تعلیمات مفتی عزیزالرحمٰن صاحب
حیات امام اعظم ابو حنیفہ
جدید تحقیقات کی روشنی میں ریسرچ کے معیار پر
نئی اور حسین ترتیب کے ساتھ۔ قیمت۔ ۸/۵۰
تذکرہ شیخ الہندؒ
سیاست حاضرہ میں دلچسپ اور عمدہ کتاب
پرانے اخبارات اور خطوط کی روشنی میں قیمت۔ ۵/
مخدوم صابر کلیریؒ
بالکل نئی تحقیقات۔ ریسرچ کے معیار پر
عمدہ رسالہ۔ قیمت -/۲
ولی کامل
شیخ و محدث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری کے
حالات زندگی انکی آپ بیتی سے زیادہ بہتر قیمت۔ ۵/۵۰
تذکرہ مشائخ دیوبند
ہندوستان کے اکابر مشائخ طریقت کے عمدہ حالات
کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ قیمت ۸/۵۰
سوانح حضرت جی
حضرت مولانا محمد یوسف صاحب امیر تبلیغ کے وہ
حالات جو طویل کتابوں میں نہیں ہیں قیمت -/۴
سیرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم
کے محدث جلیل علامہ سید جمال حسینی
کی کتاب روضۃ الاحباب کا ترجمہ اور اس پر حواشی
کامل چار جلدوں میں۔ (زیر طبع)
وصایا
قرآن اور احادیث اور سیرت، تاریخ کی
کتابوں سے ماخوذ۔ قیمت -/۲
تفسیر رشیدی
حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے
تفسیری افادات۔ جدید کارنامہ قیمت -/۳
ترجمہ زاد المعاد
علامہ ابن قیمؒ کی زاد المعاد کا ترجمہ کامل چار جلدوں
میں۔ پہلی جلد ۸/۵۰ — بقیہ زیر طبع
انفاس قدسیہ
مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی سیرت قیمت -/۴
محبت والے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والوں کے
محبت بھرے واقعات۔ قیمت
سیر اصحاب النبی
روضۃ الاحباب کا تیسرا حصہ
تفصیلی حالات سادہ زبان میں ترجمہ اور اس پر محققہ